www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

December 2010 • No. 409



بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

دسمبر 2010

فہرست

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24355454,41827083,
24356666, 46521511
Fax: 45651771
www.goodwordbooks.com
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 100
Two years Rs. 200
Three years Rs. 300

Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

قرآن میں تدبر

قرآن کی سورہ ص میں نزولِ قرآن کا مقصد بتاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ: یہ ایک مبارک کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر تدبر کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں (38: 29)۔

تدبر سے کیا مراد ہے۔ تدبر کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے آپ اس کو دھیان کے ساتھ پڑھیں اور اس کے مفہوم کو سمجھتے ہوئے اس کی تلاوت کریں۔ یہ طریقہ بھی بلاشبہہ مفید ہے، لیکن قرآن کے اعلیٰ معانی تک رسائی کے لیے یہ طریقہ کافی نہیں۔

قرآن میں تدبر کے بنیادی طور پر دو پہلو ہیں— غور وفکر، اور دعا۔ غور وفکر کیا ہے، اس کو میں نے ایک واقعہ سے سمجھا۔ ایک بار میری ملاقات ایک مسلم ادیب سے ہوئی۔ اُن کے ساتھ مجھے کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''میں غالب کا عاشق ہوں''۔ میں نے پایا کہ وہ غالب کے اشعار کے نہایت گہرے معانی بتاتے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ غالب کے دیوان کو صرف پڑھتے نہیں، بلکہ وہ اسی میں جیتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں، ''غالب کے اشعار ہر وقت میرے ذہن میں گھومتے رہتے ہیں''۔

یہی تدبر ہے۔ تدبر کا مطلب صرف یہ نہیں کہ تلاوت کے وقت قرآن کے معانی پر دھیان دیتے ہوئے اس کی تلاوت کریں۔ تدبر یہ ہے کہ قرآن آپ کے دماغ پر چھایا ہوا ہو۔ قرآن کی آیتیں ہر وقت آپ کے ذہن میں گھومتی رہیں۔ آپ قرآن کی آیتوں کو لے کر سوئیں اور قرآن کی آیتوں کے ساتھ جاگیں۔ قرآن سے اِس طرح کے فکری تعلق پیدا ہوجانے کا نام تدبر ہے۔ تدبر کی دوسری لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی برابر اللہ سے دعا کرتا رہے۔ دعا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ''رب زدنی علماً'' جیسے الفاظ اپنی زبان سے دہراتے رہیں۔ دعا کا آغاز اپنے عجز کی دریافت سے ہوتا ہے۔ جس آدمی نے دریافت کے درجے میں اپنے عجز کو نہیں جانا، وہ گویا کہ اللہ سے دعا کرنے کا اہل بھی نہیں۔

شعورِ فطرت، وجودِ خدا

قرآن کی سورہ الذاریات میں ارشاد ہوا ہے: **ومن کل شیئ خلقنا زوجین، لعلکم تذکرون** (51:49) یعنی خالق نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے، تاکہ تم اس سے سبق لو۔ اِس آیت کے مختلف پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو خود خالق کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس اصول کی رہنمائی میں غور کیا جائے تو وہ آدمی کے لیے خدا کے وجود پر ایمان کا ذریعہ بن جائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر آدمی اپنے اندر ایک اعلیٰ حقیقت کو پانے کا بے پناہ جذبہ رکھتا ہے۔ ہر انسان اِس اعتبار سے ایک متلاشی (seeker) انسان ہے۔ جب انسان کی تلاش کامیاب ہوتی ہے اور وہ خدا کی دریافت کرتا ہے تو اچانک اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی فطری تلاش کا جواب پالیا۔ اِس اعتبار سے، فطرت کا شعور گویا کہ داخلی حصہ (part) ہے اور خدا کا وجود اس کا خارجی مثنی (counter part)۔ یہی خدا کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

خدا کے وجود پر بہت سے فلسفیانہ دلائل اور سائنسی دلائل موجود ہیں۔ یہ دلائل صرف پچاس فی صد کی حد تک کام کرتے ہیں۔ یہ دلائل خدا کے وجود پر صرف عقلی قرینہ (rational probability) فراہم کرتے ہیں۔ لیکن یقین والا ایمان کسی آدمی کو صرف اُس وقت حاصل ہوتا ہے، جب کہ وہ اپنے شعور کی سطح پر خدا کو پالے۔ عقلی دلائل آدمی کو امکان (probability) تک پہنچاتے ہیں اور آدمی کا داخلی شعور اس کو یقین (conviction) عطا کرتا ہے۔

فطری شعور کی سطح پر خدا کو پانا ایسا ہی ہے جیسے ایک چھوٹا بچہ جدائی کے بعد اپنی ماں کو پالے۔ اُس وقت بچے کو بلاشبہہ یہ یقین ہوتا ہے کہ یہی خاتون میری ماں ہے۔ لیکن اُس کے اِس یقین کی بنیاد کسی عقلی تجزیہ پر نہیں ہوتی، بلکہ داخلی شعور کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ جس شخص نے خدا کو اپنے داخلی شعور کی سطح پر پایا، وہی دراصل خود کو پانے والا ہے۔ حقیقی ایمان وہ ہے جو داخلی یقین سے حاصل ہو۔ صرف عقلی دلیل کے ذریعے حاصل ہونے والا ایمان مطلوب ایمان نہیں۔

ہر چیز عارضی

قرآن کی سورہ الفجر میں بتایا گیا ہے کہ جب کسی انسان کو کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ اس کو اکرام کے معنی میں لے لیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک باعزت انسان سمجھنے لگتا ہے (89:15)۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر فخر اور بڑائی اور سرکشی کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اُس سب سے زیادہ قابلِ قدر چیز کو کھو دیتا ہے جس کو تواضع (modesty) کہا جاتا ہے۔

کسی نعمت کو پا کر اس قسم کا غیر مطلوب ذہن کیوں بنتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آدمی اس نعمت کو مستقل (permanent) سمجھ لیتا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ نعمت جو مجھ کو ملی ہے، وہ کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ اِس دنیا میں انسان کو مختلف قسم کی نعمتیں دی جاتی ہیں۔ مثلاً صحت، جوانی، دولت، اقتدار، عزت وغیرہ۔ یہ تمام نعمتیں ہر شخص کے لیے صرف وقتی ہیں۔ اگر آدمی اِن نعمتوں کو صرف وقتی سمجھے تو کبھی اس کے مزاج میں بگاڑ نہ آئے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جب بھی اس کو کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ اس کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ابدی سمجھ لیتا ہے۔ یہی بگاڑ کی اصل جڑ ہے۔

نعمت کو وقتی سمجھنا، اِس معاملے میں ایک چیک (check) کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب آدمی ایک نعمت کو وقتی سمجھے تو وہ اِس اندیشے میں مبتلا رہے گا کہ کچھ نہیں معلوم کہ کب اس سے یہ نعمت چھن جائے۔ زوالِ نعمت کا یہ احساس آدمی کے اندر فخر اور گھمنڈ کا مزاج پیدا ہونے نہیں دیتا۔ زوالِ نعمت کا احساس اس کو ہمیشہ کٹ ٹو سائز (cut to size) بنائے رہتا ہے۔ اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ آج کے لیے اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور کل کے لیے وہ خدا سے عافیت کا طلب گار بنا رہتا ہے۔ اِس کے برعکس، جس آدمی کے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اس کو جو نعمت ملی ہے، وہ اس کو ہمیشہ حاصل رہے گی، اس کا یہ احساس اس کے اندر اکڑ کا مزاج پیدا کر دے گا۔ وہ اپنے آپ کو مصنوعی طور پر بڑا سمجھنے لگے گا۔ اس کا یہ مزاج صرف اُس وقت ختم ہوگا جب کہ اس کو ملی ہوئی نعمت اس سے چھن جائے اور اس کے پاس اکڑ کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہے۔

جنت کا تعارف

قرآن کی سورہ نمبر السجدہ میں ارشاد ہوا ہے: **فلا تعلم نفس ما أخفي لهم من قرّة أعين جزاءً بما كانوا يعملون** (21:17) یعنی کسی کو خبر نہیں کہ اِن لوگوں کے لیے آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔

اس آیت کے مطابق، جنت اِس دنیا میں ایک لامعلوم چیز ہے۔ لیکن قرآن کی ایک اور آیت میں کہا گیا ہے: **يدخلهم الجنة عرّفها لهم** (47:6) یعنی خدا ان کو جنت میں داخل کرے گا جس کی اُنھیں پہچان کرادی ہے۔ دوسری آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی پہچان اِسی دنیا میں ہوجاتی ہے۔ ایسی حالت میں دونوں آیتوں کے درمیان تطبیق کی صورت کیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ پہلی آیت میں جنت کی عملی یافت کو بتایا گیا ہے اور دوسری آیت میں جنت کی فکری دریافت کا بیان ہے۔ جنت بلاشبہہ اپنے پورے مفہوم کے اعتبار سے صرف آخرت میں معلوم ہوگی، لیکن موجودہ دنیا میں انسان جنت کو بالقوہ طور پر (in terms of potential) جان لیتا ہے، اور آخرت میں وہ جنت کو بالفعل طور پر (in terms of actual) حاصل کرلے گا۔

جو انسان جنت کے بارے میں حساس ہو، جو خدا کے تخلیقی نقشہ پر غور کرتا ہو، جو دنیا اور آخرت کی حکمتوں میں تدبر کرتا ہو، وہ اِسی دنیا میں جنت کی جھلک کو پالیتا ہے۔ وہ اِس حقیقت کو دریافت کرلیتا ہے کہ موجودہ دنیا اِس انداز میں بنائی گئی ہے کہ وہ جنت کا تعارف بن گئی ہے۔

آخرت کی جنت ایک کامل (perfect) جنت ہے اور موجودہ دنیا گویا کہ غیر کامل (imperfect) جنت۔ آخرت کی جنت میں آدمی جن آسائشوں کو اپنی آئیڈیل صورت میں پائے گا، اُن آسائشوں کا تجربہ اس کو اِسی دنیا میں آئڈیل سے کم تر درجے میں ہوجاتا ہے، اِس فرق کے ساتھ کہ آخرت کی جنت ابدی جنت ہے اور موجودہ دنیا اس کا صرف وقتی اور جزئی تعارف۔

دورِ زوال کا ظاہرہ

قرآن کی سورہ الحشر میں اہلِ ایمان کو خطاب کرتے ہوئے یہ آیت آئی ہے: **ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فأنساهم أنفسهم، أولئك هم الفاسقون** (59: 19) یعنی تم اُن لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا، تو اللہ نے بھلا دئے اُن کو خود اُن کے نفس۔ یہی لوگ ہیں نافرمان:

(Believers!) Do not be like those who forgot God,
so that He caused them to forget themselves.

اِس آیت میں اُس قانون کو بیان کیا گیا ہے جو اہلِ کتاب گروہ سے متعلق ہے۔ اِس میں اہلِ اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم یہود جیسے نہ ہو جانا، ورنہ تمھارا انجام بھی یہود جیسا ہوگا، یعنی خدا کے احکام سے غفلت کے نتیجے میں خود اپنے بارے میں فراموشی میں مبتلا ہو جانا۔

اِس آیت میں مخصوص قرآنی اسلوب میں اُس واقعے کو بتایا گیا ہے جس کو دوسرے الفاظ میں زوال (degeneration) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب کوئی اہلِ کتاب گروہ اپنے بعد کے زمانے میں زوال کا شکار ہوتا ہے تو اُس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ حقیقی دینی اسپرٹ سے خالی ہو جاتا ہے۔ ابتدائی دور میں اس کا دین خوفِ خدا پر مبنی ہوتا ہے، لیکن دورِ زوال میں اس کا دین عملاً قومی فخر (pride) کے ہم معنیٰ بن جاتا ہے۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں جس معاملے کا ذکر ہے، وہ دورِ زوال میں پیدا ہونے والے اِسی قومی فخر کا معاملہ ہے۔

ایک سیکولر گروہ کی قومی پالیسی عقل (reason) پر مبنی ہوتی ہے۔ اِس کے برعکس، زوال یافتہ اہلِ کتاب کی پالیسی قومی فخر پر۔ فخر کی اِس نفسیات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا گروہ عقلی غور وفکر اور حقیقت پسندانہ مزاج سے محروم ہو جاتا ہے۔ عام سیکولر گروہ اپنی عقلیت کی بنا پر اپنی دنیا کو درست کرسکتا ہے، لیکن زوال یافتہ اہلِ کتاب اپنے فخر پسندی کے مزاج کی بنا پر اپنی دنیا کے بارے میں بھی صحیح رویّے سے محروم ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً وہ **خَسِرَ الدنیا والآخرۃ** کا مصداق بن جاتے ہیں۔

سکنڈری رول

قرآن کی سورہ الزخرف میں فطرت کا ایک قانون اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **ورفعنا بعضهم فوق بعض درجاتٍ، ليتّخذ بعضُهم بعضاً سُخريّاً** (43:32) یعنی ہم نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے، تاکہ وہ ایک دوسرے سے کام لیں۔

قرآن کی اِس آیت میں سادہ طور پر طبقاتی تفاوت یا طبقاتی امتیاز کی بات نہیں کہی گئی ہے، بلکہ اِس آیت میں طبقاتی حکمت کی بات کہی گئی ہے۔ اِس دنیا میں کوئی بڑا کام صرف اجتماعی کوشش سے ہوسکتا ہے، اور اجتماعی کوشش مفید طور پر صرف اُس وقت وجود میں آتی ہے، جب کہ افرادِ اجتماع کسی ایک شخص کو اپنا لیڈر بنانے پر پوری طرح راضی ہوجائیں۔ اجتماعی کوشش نام ہے— لیڈر کا ماتحت بن کر کوشش کرنے کا۔ جو لوگ اِس اصول پر راضی نہ ہوں، وہ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کرسکتے۔

قرآن کی اِس آیت سے سکنڈری رول (secondary role) کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ اگر ایک سو آدمیوں کا اجتماع ہے تو اس میں 99 لوگوں کو سکنڈری رول پر راضی ہونا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک شخص لیڈر بن کر اپنا قائدانہ رول ادا کرسکے۔ اِس اصول کا مظاہرہ روزانہ نمازِ باجماعت کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ نماز باجماعت یہ پیغام دیتی ہے کہ — اپنے میں سے ایک شخص کو آگے کھڑا کرکے سب کے سب بیک سیٹ (back seat) پر چلے جاؤ، ایک شخص کو امام بنا کر سب کے سب اس کے مقتدی بننے پر راضی ہوجاؤ۔

سکنڈری رول کا معاملہ صرف ایک عملی بندوبست کا معاملہ ہے۔ جہاں تک اہمیت کی بات ہے، سکنڈری رول کی اہمیت قائدانہ رول سے بھی زیادہ ہے۔ قائدانہ رول ادا کرنے والے کو اگر ایک کریڈٹ ملے گا تو سکنڈری رول ادا کرنے والے کو ڈبل کریڈٹ دیا جائے گا۔ کیوں کہ سکنڈری رول ادا کرنے والا شخص، اپنا رول ادا کرنے کے ساتھ مزید یہ کرتا ہے کہ وہ اپنی انا کو قربان کردیتا ہے۔ انا کی قربانی کے بغیر سکنڈری رول کی ادائیگی ممکن نہیں، اور انا کی قربانی بلاشبہہ تمام قربانیوں میں سب سے بڑی قربانی ہے۔

حج کا فائدہ

صحیح البخاری (کتاب الحج) کی ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مومن جب حج ادا کرکے اپنے گھر واپس لوٹتا ہے تو وہ اس دن کی طرح ہوجاتا ہے جب کہ اس کی ماں نے اس کو جنم دیا تھا (رجع کیوم ولدته أمه)۔

He returns after Hajj like a newborn child.

اِس حدیث کو سمجھنے کے لیے ایک اور حدیث کو دیکھئے۔ ایک اور روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اس کو یہودی اور مجوسی اور نصرانی بنادیتے ہیں (صحیح البخاری، کتاب الجنائز)

ان دونوں حدیثوں پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حج کی عبادت اگر صحیح اسپرٹ کے ساتھ کی جائے تو وہ حاجی کے لیے وہی چیز بن جاتی ہے جس کو آج کل کی زبان میں ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کہا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اپنے ماحول کے اعتبار سے ہر آدمی کی کنڈیشننگ ہوتی رہتی ہے۔ حج کی عبادت اس کنڈیشننگ کو توڑنے کا ذریعہ ہے۔ حج ایک ایسا کورس ہے جو ہر آدمی کی کنڈیشننگ کو ختم کرکے اس کو دوبارہ اس کی اصل فطرت پر پہنچادیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جو شخص اس سے پہلے مسٹر کنڈیشنڈ (Mr. conditioned) تھا، وہ اب مسٹر نیچر (Mr. nature) بن جاتا ہے۔

حج کا یہ فائدہ صرف اس شخص کو ملتا ہے جو حج کی پوری اسپرٹ کے ساتھ حج کی عبادت انجام دے۔ جو آدمی صرف حج کے ظاہری مراسم ادا کرے، اس کے لیے حج صرف ایک آؤٹنگ (outing) ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

حج کے بعد

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں حج ادا فرمایا۔ اس موقع پر تمام صحابہ

عرفات کے میدان میں اکھٹا ہوئے۔ یہاں آپ نے اونٹ پر بیٹھ کر ایک خطبہ دیا۔ یہ خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اِس خطبہ میں آپ نے اپنے اصحاب (معاصر اہلِ ایمان) کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: **إن اللّٰـه بعثني كافةً للناس فأدوا عني** (اللہ نے مجھ کو تمام انسانوں کے لیے بھیجا ہے، تم میری طرف سے اس کو تمام لوگوں تک پہنچا دو)۔

اس کے بعد جو ہوا وہ یہ تھا کہ راوی کے بیان کے مطابق، جس صحابیِ رسول کی سواری جس رخ پر کھڑی ہوئی تھی، اُسی رخ پر وہ روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد تمام لوگ دعوت الی اللہ کے پیغمبرانہ کام میں لگ گئے۔ انھوں نے اس وقت کی آباد دنیا کے بڑے حصہ میں دین کا پیغام پہنچا دیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کا خاتمہ دراصل ایک نئے عمل کا آغاز ہے۔ جہاں حج کے مراسم ختم ہوتے ہیں، وہاں سے ایک اور زیادہ بڑا حج شروع ہو جاتا ہے۔ یہ دعوت الی اللہ ہے۔ گویا کہ حج ایک ٹریننگ ہے اور دعوت الی اللہ اس ٹریننگ کا عملی استعمال۔

ایک حدیث کے مطابق، حج کے مراسم حضرت ابراہیم کی زندگی کے مختلف مراحل کا علامتی اعادہ ہیں۔ حضرت ابراہیم کی پوری زندگی دعوت الی اللہ کی زندگی تھی۔ یہی طریقہ ہر مومن کو اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ مثلاً احرام کیا ہے۔ وہ سادہ زندگی کی علامت ہے۔ طواف سے مراد ڈیڈیکیشن (dedication) ہے۔ سعی اس بات کا پیغام ہے کہ مومن کی دوڑ دھوپ خدا کی طرف ہونی چاہیے۔ جانور کا ذبیحہ قربانی والی زندگی کی تعلیم ہے۔ رمی جمرات کا مطلب یہ ہے کہ آدمی شیطان کو اپنے آپ سے دور بھگائے۔ لبیک لبیک کہتے ہوئے عرفات کے میدان میں پہنچنا خدا کے سامنے حاضری کو یاد دلاتا ہے، وغیرہ۔

حج بڑا حج ہے اور عمرہ چھوٹا حج۔ دونوں کا پیغام ایک ہے۔ شریعت کی یہ منشا نہیں کہ لوگ بار بار حج اور عمرہ کرتے رہیں۔ شریعت کی منشا یہ ہے کہ لوگ ایک بار حج اور عمرہ کرنے کے بعد اس کی اسپرٹ کے مطابق زندگی گزاریں اور اس کے پیغام کو ساری دنیا میں پہنچائیں۔

ذکرِ کثیر

مچھلی پانی سے باہر خشکی میں ہو تو وہ مسلسل تڑپتی ہے۔ یہ تڑپنا اس کی حالتِ فطری کا ایک خود بخود اظہار ہوتا ہے۔ یہی معاملہ ذکر کثیر کا ہے۔ ذکر کثیر دراصل تجربۂ کثیر کے ایک اظہار کا نام ہے۔ مچھلی کی مثال میں یہ اظہار مجبورانہ تجربہ کے تحت ہوتا ہے۔ اِس کے برعکس، مومن کی زندگی میں یہ اظہار ایک تجربہ کی شعوری دریافت کی صورت میں پیش آتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان اپنے خالق کے مقابلے میں کامل طور پر ایک عاجز مخلوق ہے۔ انسان کی بے شمار ضرورتیں ہیں۔ ان ضرورتوں کی تکمیل کے لیے وہ ہر لمحہ خدا کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ خدا کے مقابلے میں اس حیثیتِ عجز کی دریافت کے بعد فطری طور پر انسان ہر لمحہ خدا کی یاد میں جینے لگتا ہے۔ اِسی کا نام ذکر کثیر ہے، یعنی ایک مسلسل تجربہ کا ایک مسلسل یاد میں ڈھل جانا۔ ذکر کسی قسم کے لفظی تکرار کا نام نہیں، ذکر ایک مسلسل احساس کا مسلسل اظہار ہے۔

اگر کسی شخص کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو اس کے بعد وہ ہر لمحہ اس کے درد کو محسوس کرتا رہے گا۔ اِسی طرح انسان کو ہر لمحہ خدا کی کسی نہ کسی رحمت کا تجربہ ہوتا ہے۔ صبح وشام کا کوئی لمحہ بھی اِن تجربوں سے خالی نہیں ہوتا۔ جس آدمی کو خدا کی شعوری معرفت حاصل ہو جائے، وہ ہر لمحہ اِن ربانی تجربات کو محسوس کرتا رہے گا۔ یہ تجربہ ہر لمحہ خدا کی یاد میں ڈھلنے لگے گا۔ وہ اُسی کو لے کر سوچے گا، اسی کے مطابق احساسات اس کے اندر ابلیں گے، یہی تجربات اس کی زبان سے الفاظ بن کر ظاہر ہوتے رہیں گے۔ خدا کی اسی دوامی یاد کا نام ذکر کثیر ہے۔

جس آدمی کو ذکر کثیر کی توفیق حاصل ہو جائے، اس کو وہ سب سے بڑی چیز حاصل ہوگئی جو اِس قابل ہے کہ اِس دنیا میں آنے والا انسان اُس کو پائے اور ہر لمحہ وہ اپنے منعم کی یاد میں جینے لگے۔ خدا کی یادوں میں جینے والا انسان اپنے محسن کی یادوں میں جینے والا انسان ہے، اور کسی انسان کا سب سے بڑا شرف یہی ہے کہ وہ اپنے محسنِ حقیقی کی یادوں میں جینے والا انسان بن جائے۔

بولنے پرکنٹرول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اِسراء کے سفر میں جزاوسزا کے معاملے کو تمثیل کے روپ میں دکھایا گیا۔ اُن میں سے ایک تمثیلی واقعہ یہ تھا: **مرّ بثور عظیم یخرج من ثقب صغیر یرید أن یرجع فلا یستطیع۔ قال: ھذا الرجل یتکلم بالکلمۃ فیندم فیرید أن یردھا فلا یستطیع۔ (رواہ الطبرانی والبزّار، بحوالہ فتح الباری، جلد 7، صفحہ 63، باب حدیث الإسراء)** یعنی معراج کے دوران رسول اللہ ایک عظیم الجثہ بیل کے پاس سے گزرے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹے سوراخ سے نکلتا ہے، پھر وہ چاہتا ہے کہ وہ واپس جائے، مگر وہ واپس نہیں جاسکتا۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ اُس انسان کی مثال ہے جو ایک بات کہتا ہے، پھر اس پر شرمندہ ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی بات کو واپس لے لے، مگر وہ اس کو واپس لینے پر قادر نہیں ہوتا۔

یہ اُس انسان کی مثال ہے جو غیر ذمے دارانہ طور پر کسی کے خلاف ایک منفی بات کہہ دیتا ہے، پھر وہ دیکھتا ہے کہ اس کی منفی بات سے ایک بڑا فتنہ پیدا ہوگیا ہے۔ اب وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی بات کو واپس لے، مگر وہ اس پر قادر نہیں ہوتا۔ اس کی منفی بات ایک فتنے کو جگا دیتی ہے۔ وہ ایک ایسے فتنے کا باعث بن جاتی ہے جس کو کہنے والے نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اِس حدیث کا مدعا یہ ہے کہ آدمی کو بولنے کے معاملے میں بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ اگر آدمی کوئی مثبت بات بولے تو اس میں کسی فتنے کا اندیشہ نہیں ہے۔

لیکن منفی بات کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ منفی بات ہمیشہ بہت تیزی سے پھیلتی ہے اور پھیلنے کے وقت اس میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ابتدا میں وہ بظاہر ایک چھوٹی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن لوگوں کے درمیان پھیلنے کے بعد وہ نہایت سنگین صورتِ حال اختیار کرلیتی ہے، یہاں تک کہ آخر کار اس کے نتیجے میں نفرت اور تشدد کا جنگل اگ آتا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کے اوپر فرض ہے کہ وہ نتیجہ (result) سے پہلے سوچے، وہ بولنے سے پہلے اس کے نتیجے پر غور کرے۔

مذہبی آزادی کا دور

خباب بن الارتؓ ایک مشہور صحابی ہیں۔ 37 ہجری میں 73 سال کی عمر میں کوفہ (عراق) میں ان کا انتقال ہوا۔ مکی دور کے آخر کا واقعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت کعبہ کے سائے میں ایک کمبل کے تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ میں نے آپ سے کہا: اے خدا کے رسول، کیا آپ اللہ سے ہمارے لیے دعا نہیں کرتے۔ آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور آپ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: تم سے پہلے کی امتوں کا یہ حال تھا کہ ان کے اوپر لوہے کی کنگھی کی جاتی تھی جو اُن کے گوشت سے گزر کر ان کی ہڈیوں تک پہنچ جاتی تھی، مگر یہ چیز ان کو ان کے دین سے پھیرتی نہیں تھی۔ اِسی طرح اُن کے سر پر آرا چلایا جاتا تھا جو اُن کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیتا تھا، مگر یہ چیز ان کو ان کے دین سے پھیرتی نہیں تھی۔ اور اللہ اس امر کو ضرور پورا کرے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو اللہ کے سوا کسی اور چیز کا خوف نہ ہوگا (**لیتمّنّ الله هذا الأمر حتى يسير الراكب من صَنعاء إلى حضر موت، ما يخاف إلاّ الله) صحيح البخاری، کتاب مناقب الانصار۔**

اِس حدیث میں دراصل تاریخِ دعوت کے دو دور کو بتایا گیا ہے، پہلا دور وہ ہے جب کہ دعوت الی اللہ کا کام مذہبی تعذیب (religious persecution) کے حالات میں ہوتا تھا۔ دوسرا دور وہ ہے جب کہ یہ ممکن ہو جائے گا کہ دعوت الی اللہ کا کام مذہبی آزادی (religious freedom) کے حالات میں انجام دیا جانے لگے۔ رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ ساتویں صدی عیسوی میں جو انقلابی عمل شروع ہوا، وہ دونوں کے درمیان حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ انقلابی عمل (revolutionary process) اب اپنی تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اب پوری طرح یہ ممکن ہو گیا ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام پوری آزادی کے ساتھ کسی روک ٹوک کے بغیر انجام دیا جا سکے، صرف اِس واحد شرط کے ساتھ کہ داعی، تشدد (violence) سے مکمل طور پر پرہیز کرے، وہ کامل طور پر پرامن طریقِ کار پر قائم رہے۔ یہ تبدیلی اب پیشین گوئی نہیں ہے، بلکہ وہ اب پوری طرح واقعہ بن چکی ہے۔

مطالعہ قرآن کی اہمیت

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما:**من قرأ القرآن لم يُرَدّ إلى أرذل العمر** (**صحيح الترغيب للألباني، رقم الحديث:** 1435) یعنی جس نے قرآن کو پڑھا، وہ کبھی ناکارہ عمر تک نہیں پہنچے گا۔

اِس حدیث میں قرآن پڑھنے سے مراد قرآن کا مطالعہ ہے۔ جو آدمی قرآن کا گہرا مطالعہ کرے گا، اس کو قرآن سے مسلسل فکری غذا (intellectual food) ملتی رہے گی۔ یہ فکری غذا آدمی کو مسلسل توانائی دیتی رہے گی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ناکارہ عمر (abject old age) تک نہیں پہنچے گا۔ اس کا ذہن مسلسل طور پر بیدار اور متحرک (active) رہے گا۔ ایسے آدمی کا جسم بوڑھا ہوگا، لیکن اس کا دماغ کبھی بوڑھا نہیں ہو سکے گا۔

ریسرچ کے ذریعے یہ معلوم ہوا ہے کہ انسان کے جسم اور دماغ میں ایک فرق ہے۔ خالص حیاتیاتی اعتبار سے جسم پر بڑھاپا آتا ہے، لیکن دماغ یا برین (brain) پر بڑھاپا نہیں آتا۔ کوئی آدمی اگر اپنے دماغ کو منفی سوچ (negative thinking) سے بچائے، وہ مکمل طور پر اس کو مثبت سوچ (positive thinking) کا حامل بنائے تو اس کے دماغ پر بڑھاپا نہیں آئے گا۔ کوئی شخص قرآن کا گہرا مطالعہ کرے تو اس کو ہر دن قرآن سے تخلیقی افکار کی غذا ملتی رہے گی۔ اس کو کبھی ذہنی فاقہ (intellectual starvation) کا تجربہ نہیں ہوگا۔ اس کا دماغ مسلسل طور پر سرگرم رہے گا، وہ مسلسل طور پر تخلیقی فکر سے بھرا رہے گا۔

مادی غذا جس طرح جسم کو طاقت دیتی ہے، اُسی طرح فکری دریافتیں انسان کو توانائی عطا کرتی ہیں۔ انسان کے لیے سب سے زیادہ پرجوش تجربہ، دریافت (discovery) کا تجربہ ہوتا ہے۔ قرآن کا گہرا مطالعہ کرنے والے کو مسلسل طور پر اِس قسم کا تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی تخلیقی تجربہ کسی آدمی کے لیے اِس امر میں مانع بن جاتا ہے کہ وہ بڑھاپے کی عمر تک پہنچے اور عملاً ناکارہ ہوکر رہ جائے۔

بعد کے زمانے کا فتنہ

حضرت علی بن ابی طالب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سیخرج قومٌ فی آخر الزّمان ، أحداث الأسنان، سُفهاء الأحلام، یقولون من خیر قولِ البَریَّة۔ یقرؤن القرآن، لا یجاوز إیمانهم حناجرهم، یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرّمیة (صحیح البخاری، کتاب استتابة المرتدین، باب قتل الخوارج) یعنی آخری زمانے میں کچھ لوگ نکلیں گے، کم عمر والے، کم عقل والے۔ بظاہر وہ اچھی باتیں کریں گے۔ وہ قرآن کو پڑھیں گے، مگر ایمان اُن کے حلق سے تجاوز نہ کرے گا۔ وہ دین سے اِس طرح نکلے ہوئے ہوں گے جس طرح تیر شکار کے اوپر سے نکل جاتا ہے۔ اِس حدیث میں ایک چیز مابین السطور (between the lines) ہے۔ اس کو شامل کرنے کے بعد ہی یہ حدیث پوری طرح سمجھی جاسکتی ہے، وہ مابین السطور یہ ہے کہ آئندہ ایسے حالات پیدا ہوں گے جو لوگوں کو یہ موقع دیں گے وہ علم اور تجربہ کی کمی کے باوجود نمایاں ہوجائیں گے، وہ لوگوں کے درمیان بڑے بڑے درجے حاصل کرلیں گے۔

موجودہ زمانہ وہی زمانہ ہے جس کی پیشین گوئی حدیث میں کی گئی تھی۔ موجودہ زمانے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بعد کو پیدا ہونے والے حالات سے کیا مراد ہے۔ وہ ہے میڈیا، اسٹیج، آزادی، جمہوریت، دولت کی فراوانی، مظاہرہ کی سیاست، مسلمانوں کی عظیم اکثریت، وغیرہ۔ آج صاف نظر آتا ہے کہ اِن نئی چیزوں نے کس طرح لوگوں کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ بے صلاحیت ہونے کے باوجود خوش نما الفاظ بول کر لوگوں کے درمیان اونچا مقام پالیں، جو داخلی اعتبار سے سطحی ہونے کے باوجود ظاہری نمائش کے ذریعے عوامی مقبولیت حاصل کرلیں، جو قرآن کی روح سے خالی ہونے کے باوجود محض اپنی خوش الحانی کے ذریعے شہرت حاصل کرلیں، جو خدا کے خوف اور آخرت سے غافل ہونے کے باوجود عوامی تقریریں کرکے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیں۔ یہ سب صنعتی دور میں پیدا ہونے والے نئے مواقع کی بنا پر پیش آئے گا۔ افراد ہمیشہ حالات سے پیدا ہوتے ہیں، نہ کہ حالات کے بغیر۔

شیطان کا پردہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طویل حدیث مروی ہے۔ اُس کا ایک حصہ یہ ہے: **هذه الشياطين يحومون على أعيُنِ بني آدم أن لا يتفكروا في ملكوت السماوات والأرض۔ ولو لا ذلك لرأوا العجائب** (مسند احمد، جلد 2، صفحہ 353) یعنی یہ شیاطین، بنی آدم کی آنکھ کے سامنے منڈلاتے رہتے ہیں، تاکہ وہ آسمان وزمین میں خدائی قدرت پر غور نہ کریں۔ اگر ایسا نہ ہوتو یقیناً وہ عجائب کو دیکھیں۔

ہمارے گردوپیش جو کائنات ہے، اس کو علمی اصطلاح میں فطرت (nature) کہا جاتا ہے۔ اِس وسیع عالم فطرت میں بے شمار واقعات یا مظاہر ہیں جو ہر وقت انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہر آنکھ والا انسان اُن کو دیکھتا ہے اور اُن کا تجربہ کرتا ہے، لیکن بیش تر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اِس آیت کا مصداق بنے رہتے ہیں: **وكأين مِن آيةٍ في السماوات والأرضِ يمرّون عليها، وهم عنها معرضون** (12:105)

یہ کائناتی واقعات دراصل خدائی نشانیاں (divine signs) ہیں، وہ تخلیق (creature) کی صورت میں اپنے خالق (Creator) کا تعارف ہیں۔ انسان اگر کھلی آنکھ سے دیکھے تو وہ اِن واقعات میں عجائب قدرت کا مشاہدہ کرے گا۔ لیکن شیطان آدمی کے ذہن میں ایسی باتیں ڈالتا ہے کہ وہ اِن کائناتی واقعات کو صحیح زاویۂ نظر سے نہ دیکھ سکے۔ شیطان، آدمی کے ذہن میں یہ تصور ڈالتا ہے کہ یہ سب واقعات خودکار قوانین کا نتیجہ ہیں، نہ کہ خدائی قدرت کا نتیجہ۔ شیطان یہ کوشش کرتا ہے کہ آدمی اِن واقعات کو نصیحت کے پہلو سے نہ دیکھے، بلکہ وہ صرف اِس نظر سے دیکھے کہ کس طرح اُن کے مادّی فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ شیطان یہ کوشش کرتا ہے کہ آدمی اپنے اردگرد کے واقعات کو فار گرانٹیڈ (for granted) طور پر لیتا رہے، وہ اُن کے بارے میں زیادہ غور وفکر نہ کرے۔ یہی وہ شیطانی وسوسے ہیں جو انسان کو حقائق کی صحیح معرفت سے محروم کردیتے ہیں۔

قیامت کی ایک نشانی

حدیث میں قربِ قیامت کی بہت سی علامتیں بتائی گئی ہیں، اُن میں سے ایک طویل روایت میں اس کی ایک علامت اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: **أمورکم إلیٰ نسائکم (الترمذی، کتاب الفتن)** یعنی اُس زمانے میں لوگوں کے معاملات اُن کی عورتوں کے سپرد ہو جائیں گے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ساتویں صدی عیسوی میں کہی تھی، اُس وقت ساری دنیا میں عورت اور مرد کے درمیان تقسیم کار (division of work) کا اصول رائج تھا۔ داخلی امور بنیادی طور پر عورتوں سے متعلق ہوتے تھے، اور خارجی امور بنیادی طور پر مردوں سے تعلق رکھتے تھے۔ پیغمبر اسلام نے پیشین گوئی کے طور پر فرمایا کہ ایک وقت آئے گا، جب کہ یہ حد بندی ٹوٹ جائے گی۔ عورتیں بھی اُسی طرح زندگی کے ہر شعبے میں دکھائی دیں گی جس طرح مرد دکھائی دیتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں صنفی مساوات (gender equality) اور فیمن ازم (feminism) کی تحریکوں نے تاریخ میں پہلی بار یہ صورتِ حال پیدا کی ہے کہ عورت اور مرد دونوں صنفوں کے درمیان تقسیم کار کا اصول ٹوٹ گیا۔ زندگی میں جو شعبے روایتی طور پر مردوں سے متعلق ہوتے تھے، اُس میں اب عورتیں بڑے پیمانے پر دخیل ہوگئی ہیں۔ موجودہ زمانے میں عورتیں نہ صرف مقامِ عمل (work place) میں مشترک طور پر دکھائی دیتی ہیں، بلکہ وہ فیصلہ کرنے والے شعبوں (decision-making) میں برابری کے ساتھ شرکت کی دعوے دار ہیں۔ عملی نتائج کے اعتبار سے اِس صورتِ حال کی حقیقت کیا ہے، اِس سے قطعِ نظر، اِس پیشین گوئی کا موجودہ زمانے میں واقعہ بننا ایک بے حد سنگین الارم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت غالباً اب بہت قریب آچکی ہے۔ انسانی تاریخ اب اپنے خاتمے پر پہنچنے والی ہے۔ یعنی وہ وقت جب کہ فرشتہ اسرافیل اپنا صور پھونک دے اور دنیا کا موجودہ نظام ٹوٹ پھوٹ جائے۔ اس کے بعد تمام انسان دوبارہ زندہ ہو کر میدانِ حشر میں اکٹھا ہوں، اور خدا کی طرف سے تمام عورتوں اور مردوں کے مستقبل کا آخری فیصلہ کر دیا جائے۔

بعثتِ نبوی اور قیامت

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **بُعثتُ أنا و الساعة کھاتین (صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی بُعثت أنا و الساعة)** یعنی میں اور قیامت دونوں ایک ساتھ بھیجے گئے ہیں، پھر آپ نے اپنی دونوں انگلیوں کی طرف اشارہ فرمایا، یعنی جس طرح یہ دوانگلیاں ایک دوسرے کے قریب ہیں، اُسی طرح میں اور قیامت ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔

اِس حدیث میں دراصل ایک تاریخی پراسس (process) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے ذریعے سے انسانی تاریخ میں ایک پراسس کا آغاز ہوا ہے جس کی تکمیل پر قیامت ہے:

I have initiated a process in human history the culmination of which is Qayamah (Doomsday)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جو تاریخی پراسس جاری ہوا، اس کے چار بڑے مرحلے ہیں — اظہارِ دین، حفاظتِ وحی، تبیینِ حق، ادخالِ کلمہ۔ یہ چاروں مرحلے قیاسی نہیں، بلکہ وہ قرآن اور حدیث کے مطالعے سے واضح طور پر معلوم ہوتے ہیں۔

1- پہلا مرحلہ وہ ہے جس کو قرآن میں اظہار دین (48: 28) یا استیصالِ فتنہ (8: 39) کہا گیا ہے۔ اِس سے مراد ہے مذہبی جبر (religious persecution) کا خاتمہ اور کامل معنوں میں مذہبی آزادی (religious freedom) کے دور کو لانا۔ اصحابِ رسول نے اِس کام کو انجام دیا۔ انھوں نے اپنی قربانیوں کے ذریعے شرک کو سیاسی اقتدار سے جدا کر دیا۔ اصحابِ رسول کا یہی کارنامہ ہے جس کو قرآن میں **وقاتلوھم حتی لا تکون فتنة ویکون الدین کله لله** کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

2- دوسرا مرحلہ حفاظتِ وحی کا ہے، وحی متلو بھی اور وحی غیر متلو بھی۔ اِس مرحلے کا ذکر قرآن کی سورہ نمبر 15 میں اس طرح آیا ہے: **إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون** (15: 9) اِس آیت میں "الذکر" سے مراد قرآن ہے۔ آیت میں حفاظتِ وحی کے عمل کو براہِ راست اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ اپنے فرشتے بھیجے گا اور وہ اس کام کو انجام دیں گے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کچھ لوگوں کو توفیق دے گا اور وہ اللہ کی خصوصی مدد سے اس کام کو انجام دیں گے۔

حفاظت کا یہ کام بنیادی طور پر عباسی دور میں انجام پایا۔ اُس زمانے میں قرآن اور قرآنی علوم کو حفاظت کے آخری درجے تک پہنچا دیا گیا۔ اِس زمانے میں حدیث کی تدوین کا کام بھی اعلیٰ سطح پر انجام دیا گیا، نیز دوسرے متعلق علوم پر اتنا زیادہ تحریری کام ہوا کہ اُن سے ایک پورا کتب خانہ تیار ہوگیا۔

3- اِس سلسلے میں تیسرا کام وہ ہے جس کو قرآن میں تبیینِ حق (41: 53) کہا گیا ہے، یعنی آفاق اور انفس میں چھپی ہوئی خدائی نشانیوں کو کھولنا، تاکہ دینِ خداوندی کے حقائق خود علمِ انسانی کی سطح پر ثابت شدہ بن جائیں۔ یہ کام ساتویں صدی اور آٹھویں صدی عیسوی میں مسلم سائنس دانوں نے شروع کیا، پہلے بغداد میں اور پھر اندلس میں۔ اُس زمانے کے مسلم سائنس دانوں نے علومِ فطرت کی تحقیق میں کافی کام کیا، لیکن وہ اُس کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمان مذہبی عقیدہ اور سائنسی تحقیق کو ایک دوسرے سے الگ نہ کر سکے۔ چناں چہ مسلمانوں کا مذہبی طبقہ اور ان کے سائنسی علماء کے درمیان مسلسل نزاعات پیش آتے رہے، جس کی وجہ سے یہ کام زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اِس کی تفصیل درج ذیل کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے:

تاریخ اسلام، از: اکبر شاہ نجیب آبادی، جلد سوم

History of the Arabs, by Philip K Hitti

اِن نزاعات کی بنا پر مسلمان تبیینِ حق بالفاظِ دیگر علوم فطرت کے انکشاف کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ اِس کام کی تکمیل نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے بعد یورپ میں انجام پائی اور پھر وہ امریکا

میں جاری رہی۔ اِس معاملے کی تفصیل درج ذیل کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے:

The Conflict between Science and the Religion, by J W Draper (1882)

اس کا سبب یہ ہے کہ مغربی قوموں نے مذہبی عقیدہ اور سائنسی تحقیق کے کام کو ایک دوسرے سے الگ کردیا، یہاں تک کہ بیسویں صدی کے آخر میں تبیین حق کا یہ کام اپنے آخری مرحلے تک پہنچ گیا۔ اب زیادہ تر فطرت کی اِن دریافتوں کو دینِ حق کے لیے استعمال کرنا ہے اور ان کی بنیاد پر دینِ حق کو خود انسانی علم کی سطح پر ثابت شدہ بنانا ہے۔

4- اِس سلسلے کا چوتھا کام وہ ہے جس کو حدیث میں 'ادخالِ کلمہ' کہا گیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمین کے اوپر کوئی بھی چھوٹا یا بڑا گھر نہیں بچے گا جس کے اندر اسلام کا کلمہ نہ پہنچ جائے (مسند احمد، جلد 6، صفحہ 4)

واقعات بتاتے ہیں کہ چار مطلوب مرحلوں میں سے تین مرحلے گزر چکے ہیں۔ اب اظہارِ دین بھی ہو چکا ہے اور حفاظتِ دین کا کام بھی انجام پا چکا ہے۔ اِسی طرح تبیین حق کا کام بھی بقدر ضرورت انجام پا چکا ہے۔ اب اکیسویں صدی میں اہلِ ایمان کو جو کام انجام دینا ہے، وہ ادخالِ کلمہ ہے، یعنی خدا کی کتاب کو دنیا کے تمام لوگوں تک پہنچا دینا۔ جدید ٹکنالوجی اور کمیونکیشن کے ذرائع اِس بات کا اشارہ ہیں کہ اب اہلِ ایمان کا یہی واحد کام ہے کہ وہ اِن جدید مواقع کو استعمال کرتے ہوئے خدا کے کلام اور اس سے متعلق تشریحی لٹریچر کو تمام انسانوں تک پہنچا دیں۔ گلوبل وارمنگ کے نئے ظاہرہ کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ہیں، وہ مزید یہ بتا رہے ہیں کہ قیامت اب بہت قریب آچکی ہے۔ اِس کا تقاضا ہے کہ اہلِ ایمان اپنی ساری توانائی کو اِس آخری کام میں لگا دیں، اِس سے پہلے کہ صورِ اسرافیل پھونک دیا جائے اور اُن کے لیے کچھ کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔

آج اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس کو اظہارِ دین کے عمل کا کریڈٹ ملے تو اب یہ ناممکن ہو چکا ہے۔ اِسی طرح حفاظتِ دین کا کریڈٹ بھی لینے والے لے چکے، اب آج کے لوگوں کے لیے اس کا

کریڈٹ لینے کا موقع باقی نہیں رہا۔ اِسی طرح آج اللہ کی توفیق سے ایسا لٹریچر تیار ہو چکا ہے جس نے تبیینِ حق کے کام کو ضروری حد تک انجام دے دیا ہے۔ اِس کام کا کریڈٹ (credit) لینے کا موقع بھی اب کسی کے لیے باقی نہیں رہا۔

اب اکیسویں صدی عیسوی میں اصلاً ایک ہی کرنے کا کام ہے جس کا کریڈٹ آج کے لوگوں کو مل سکتا ہے، اور وہ ہے ادخالِ کلمہ کا کام، یعنی پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اللہ کے پیغام کو تمام لوگوں تک پہنچانا۔ جدید کمیونکیشن کے ذرائع کو بھر پور استعمال کرتے ہوئے اس کو تکمیل کے مرحلے میں داخل کر دینا۔ اکیسویں صدی کے اہلِ ایمان کو جاننا چاہیے کہ ابتدائی تین کریڈٹ کو لینے کا وقت اب اُن کے لیے باقی نہیں رہا، کیوں کہ اللہ کے کچھ بندے اِس کام کو انجام دے چکے ہیں۔ اب جس کام کا کریڈٹ لینے کا موقع باقی ہے، وہ صرف ادخالِ کلمہ ہے۔ یا تو اِس کام کو انجام دیجئے اور اللہ کے یہاں اس کا انعام حاصل کیجئے، یا پھر اس کام سے غافل رہیے اور قیامت میں اُن لوگوں کے ساتھ اللہ کے حضور پہنچئے جن کو اللہ کی آخری عدالت میں محرومی کے سوا کچھ اور ملنے والا نہیں۔

معرفت کی پہچان

ماہ نامہ الرسالہ، ستمبر 2010 میں 12 صفحات پر مشتمل ایک طویل مقالہ چھپا ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے: معرفت — مقصدِ انسانیت۔ اس کو پڑھ کر ایک صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کا یہ مضمون مجھ کو بہت پسند آیا۔ اب یہ سوال ہے کہ معرفت کی پہچان کیا ہے، یعنی کوئی شخص کیسے یہ سمجھے کہ اس کو وہ چیز حاصل ہوئی ہے جس کو دین میں معرفت کہا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ قرآن میں اس کی پہچان بتادی گئی ہے، اور وہ ذکر کثیر (33: 41) ہے، یعنی بہت زیادہ خدا کو یاد کرنا۔ معرفت دراصل رب العالمین کی ڈسکوری ہے۔ جب رب العالمین کی ڈسکوری (دریافت) کسی کو معرفت کے درجے میں حاصل ہوجائے تو اس کے بعد اس کے اندر ایک گہرا ذہنی انقلاب آجاتا ہے۔ اب خدا ہی اس کی سوچ کا مرکز ومحور بن جاتا ہے۔ ایسا انسان صبح وشام خدا کو یاد کرتا ہے، وہ ہر لمحہ اس کے بارے میں سوچتا ہے، وہ اسی کا چرچا کرتا ہے۔ یہی اس کے وجود کی سب سے زیادہ نمایاں پہچان بن جاتی ہے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ کسی شخص کو اگر کوئی ایسی چیز مل جائے جس کو وہ بہت بڑی چیز سمجھتا ہو تو وہ خود اپنے فطری تقاضے کے تحت اس کا بہت زیادہ چرچا کرتا ہے۔ اس کو اُس چیز کی یاد میں اتنی لذت ملتی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ اُسی کے بارے میں سوچتا اور بولتا رہے۔

یہی معاملہ خداوند عالم کی معرفت کا ہے۔ جب کسی شخص کو دریافت کے درجے میں اللہ کی معرفت ہوجائے تو یہ معرفت اس کے ذہن پر چھا جاتی ہے۔ اپنے فطری تقاضے کے تحت، وہ اُسی کے بارے میں سوچتا ہے، اسی کے بارے میں بولتا ہے، حتی کہ اپنی تنہائیوں میں وہ اسی کے تصور میں غرق رہتا ہے۔ اس کا ہر تجربہ اس کے لیے خدا کی معرفت میں ڈھل جاتا ہے۔ جب کسی انسان کا یہ حال ہوجائے تو یہ اِس بات کی پہچان ہے کہ اس کو وہ ربانی رزق عطا ہوا ہے جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔

انوکھی تخلیق

شمسی نظام (solar system) اور اس کے اندر استثنائی نوعیت کا سیارہ زمین (Planet earth) ایک انوکھی تخلیق ہے۔ یہاں انسان کے لیے اس کی ضرورت کی تمام چیزیں اعلیٰ معیار کے ساتھ موجود ہیں۔لیکن اِسی کے ساتھ یہاں ایک اور چیز بھی ہے جس کو قرآن میں کبد (90:5) کہا گیا ہے، یعنی یہاں اگر چہ انسان کے لیے ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں، لیکن اِسی کے ساتھ یہاں انسانی زندگی کے ہم راہ مشقت (distress) شامل کردی گئی ہے۔ انسان کچھ بھی کرے، لیکن وہ اپنی زندگی کو کسی بھی حال میں درد وکرب سے بچا نہیں سکتا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ جنت جب جنت میں داخل ہوں گے اور وہاں کے ماحول کا تجربہ کریں گے تو ان کی زبان سے نکلے گا: **الحمد لله الذي أذهب عنّا الحزن** (35: 34) یعنی اُس اللہ کا شکر ہے جس نے خوف وحزن کو ہم سے دور کردیا:

Praise be to God who has taken away all sorrow from us.

اہلِ جنت کا یہ کلمہ دراصل دریافت کا ایک کلمہ ہوگا۔ وہ جنت کی صورت میں ایک نئے اور انوکھے تخلیقی کرشمہ کی دریافت کریں گے، یہ دریافت ک جو خالق کبد والی دنیا کی تخلیق کرسکتا تھا، وہ اِس طاقت کا بھی حامل تھا کہ ایک اور دنیا کی تخلیق کرے جہاں خوف اور حُزن کی کوئی صورت نہ پائی جائے۔ ایسی ایک جنت بنانے کے لیے ایک اور دنیا تخلیق کرنے کی ضرورت تھی اور خدا نے جنت کی صورت میں اُس نئی دنیا کی تخلیق کردی۔

اہل جنت جب ایک ایسی انوکھی دنیا کو پائیں گے تو کمالِ استعجاب سے وہ کلمہ ان کی زبان پر جاری ہوجائے گا جس کو قرآن میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: **وقالوا الحمد لله الذی أذهب عنا الحزن**۔خوف وحزن سے خالی دنیا کی تخلیق ایک ایسا انوکھا واقعہ ہے جس کو ظہور میں لانا، قادرِ مطلق خدا کے سوا کسی اور کے لیے ممکن نہیں۔

قرآن کے انگریزی تراجم

سعودی عرب (مدینہ) میں قرآن کی اشاعت کے لیے ایک بڑا ادارہ قائم ہے۔ اس کا نام یہ ہے: **مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف**۔ اِس ادارے کے تحت 2007 میں انگریزی زبان میں ایک کتاب چھاپی گئی ہے۔ اِس کتاب میں قرآن کے انگریزی تراجم وتفاسیر کا تعارف اور تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب 474 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے مصنف پروفیسر عبد الرحیم قدوائی (مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ) ہیں۔ اس کتاب کا پورا نام یہ ہے:

Bibliography of the Translations of the Meanings of the Glorious Quran into English: (1649-2002) A Critical Study

اِس کتاب میں قرآن کے 47 انگریزی تراجم وتفاسیر کا ذکر ہے۔ یہ تراجم پچھلے ساڑھے تین سو سال کے درمیان کئے گئے۔ اِن کے مترجمین میں مسلم نام بھی ہیں اور غیر مسلم نام بھی۔ کتاب میں درست طور پر یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ یہ انگریزی تراجم مغربی دنیا میں یا انگلش اسپیکنگ دنیا میں مقبول نہ ہوسکے۔ یہ ترجمے اگرچہ لوگوں کے درمیان تقسیم کئے گئے، لیکن مطالعے کے اعتبار سے وہ عملاً مقبول نہ ہوسکے۔ یہ بات بجائے خود واقعہ ہے، لیکن کتاب میں اِس کی نشان دہی موجود نہیں کہ اِس غیر مقبولیت کا اصل سبب کیا تھا۔

انگریزی ترجموں کی اِس غیر مقبولیت کا اصل سبب یہ تھا کہ یہ ترجمے قرآنی اسلوب کی اصل خصوصیت سے محروم تھے، وہ خصوصیت قرآن کی اِس آیت میں بتائی گئی ہے: ولقد يسَّرنا القرآن للذكر (54:17) یعنی ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کردیا ہے۔ اس آیت میں آسانی سے مراد وضوح ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کے اسلوب میں سادگی اور وضوح بدرجۂ اتم (par excellence) پایا جاتا ہے۔ اِسی امتیازی خصوصیت کی بنا پر قرآن نے عربوں کے ذہن کو مسخر کرلیا۔ مگر عجیب بات ہے قرآن کے انگریزی ترجموں میں قرآنی اسلوب کی یہی امتیازی خصوصیت موجود نہیں۔ یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر قرآن کے انگریزی تراجم، انگریزی دانوں کے درمیان زیادہ مقبول نہ ہوسکے۔

فکری انقلاب کی ضرورت

پرنٹنگ پریس کا زمانہ آنے کے بعد مسلمانوں میں اصلاح کی بے شمار تحریکیں اٹھیں۔ ہر ملک میں اسلام کے نام پر دھوم دکھائی دینے لگی، لیکن نتیجہ تقریباً صفر ہے۔ اِس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ شکایت کی زبان بول رہے ہیں۔ اگر اسلام کے نام پر کی جانے والی دھوم درست ہوتو آج لوگوں کو اعتراف کی زبان میں بولنا چاہیے تھا، نہ کہ شکایت کی زبان میں۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلم ملت کا مسئلہ فقدانِ عمل کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ فقدانِ نتیجہ کا مسئلہ ہے۔ ہمارے پچھلے رہنماؤں نے عمل کا طوفان کھڑا کیا، لیکن آج اُن کی طوفانی سرگرمیوں کا کوئی حقیقی نتیجہ نظر نہیں آتا۔ موجودہ زمانے میں مسلم ملت کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ کیوں ایسا ہوا کہ اُن کے رہنماؤں نے کھیتی کی، مگر مسلمانوں کو اُس سے فصل نہیں ملی۔ ہمارے رہنماؤں نے باغ لگائے، لیکن مسلمان اس کے پھل سے محروم رہے۔ اِس المیہ کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو مسلم رہنما اٹھے، اُن سب کا نقطۂ آغاز غلط تھا۔ وہ اِس مفروضہ پر کھڑے ہوئے کہ مسلم ملت موجود ہے، اب اس کو صرف متحرک کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلم نام سے صرف ایک بھیڑ موجود تھی، نہ کہ حقیقی معنوں میں امت۔ ایسی حالت میں اصلاح امت کے کام کا نقطۂ آغاز لوگوں کے ذہن کی تشکیل نو تھا، نہ کہ جذباتی باتیں کرکے اُنھیں متحرک کرنا۔ موجودہ زمانے میں مسلم رہنماؤں نے جو طریقِ کار اختیار کیا، اُس کی ایک مثال ڈاکٹر محمد اقبال کا یہ مصرعہ ہے: ذرا نم ہوتو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔ اقبال کا حسب ذیل شعر موجودہ زمانے کے تمام مسلم رہنماؤں کے فکر کی ترجمانی کرتا ہے:

نوا را تلخ تر می زن، چو ذوقِ نغمہ کم یابی   حُدی را تیز تر می خواں، چو محمل را گراں بینی

مسلم رہنماؤں نے مٹی کو صرف نم نہیں کیا، بلکہ اُس کو جل تھل کردیا، مگر عمل کے اعتبار سے اس کا کوئی نتیجہ نہیں۔ اِس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کیا جائے اور امت کی اصلاح کی نئی منصوبہ بندی کی جائے۔

بابری مسجد کا مسئلہ

اجودھیا کی بابری مسجد کو مغل دور کے گورنر میر باقی نے 1528 میں بنوایا تھا۔ اس معاملے میں مسلمانوں کو پہلا شاک (shock) اُس وقت لگا جب کہ 23 دسمبر 1949 کی رات کو کچھ ہندوؤں نے مسجد کے اندر تین مورتیاں رکھ دیں۔ اس کے بعد دوسرا بڑا شاک اُس وقت لگا، جب کہ 6 دسمبر 1992 کو بابری مسجد ڈھادی گئی اور اُس کی جگہ ایک عارضی مندر (make-shift temple) بنادیا گیا۔ اِس کے بعد اِس معاملے میں تیسرا شاک مسلمانوں کو 30 ستمبر 2010 کو لگا۔ یہ وہ تاریخ ہے جب کہ تقریباً 60 سالہ عدالتی کارروائی کے بعد ہائی کورٹ نے بابری مسجد کے بارے میں اپنا فیصلہ دیا۔ یہ فیصلہ مسلمانوں کے نزدیک، ان کی امیدوں کے مطابق نہیں تھا، اِس لیے دوبارہ وہ ذہنی صدمہ کا شکار ہوگئے۔

اِس طرح کے بحران (crisis) کے معاملے میں اسلام کی رہنمائی کیا ہے۔ کیا اسلام میں صرف نماز، روزہ کے احکام ہیں یا اُس میں بابری مسجد جیسے حادثے کے بارے میں بھی واضح رہنمائی موجود ہے۔ میرے نزدیک، بلاشبہہ یہ رہنمائی اسلام میں موجود ہے۔ ذیل میں مختصر طور پر اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

1- بابری مسجد کے معاملے میں اسلامی تعلیمات سے انحراف کا پہلا واقعہ 1528 میں پیش آیا، جب کہ اجودھیا میں یہ مسجد بنائی گئی۔ اُس وقت وہاں ''رام چبوترہ'' کے نام سے ایک چبوترہ موجود تھا، یہاں رام اور سیتا کی کچھ یادگاریں مثلاً سلوٹا اور بیلن جیسی چیزیں موجود تھیں اور ہندو اس کو سیتا کے رسوئی گھر کے طور پر مقدس سمجھتے تھے۔ بابر کے گورنر میر باقی نے مسجد بناتے ہوئے اِس رام چبوترہ کو اس کے صحن میں شامل کردیا۔ یہ طریقہ اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف تھا۔

اس کی ایک متعلق مثال یہ ہے کہ اسلام کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروق اپنے زمانۂ خلافت (636ء) میں مدینہ سے چل کر یروشلم (فلسطین) گئے۔ وہاں یروشلم کے بطریق (بشپ) سے گفتگو کرکے دونوں کے درمیان ایک صلح نامہ طے ہوا۔ اُس وقت حضرت عمر فاروق یروشلم کے کنیسۃ القیامہ

(Church of Resurrection) میں تھے۔ عصر کی نماز کا وقت آگیا اور آپ نے نماز پڑھنا چاہا تو مسیحی بطریق نے کہا کہ آپ یہیں چرچ کے اندر نماز پڑھ لیجئے۔ حضرت عمر نے کہا کہ نہیں، میں رمية الحجر، یعنی پتھر پھینکنے کی دوری (stone's throw) پر جاؤں گا اور وہاں نماز پڑھوں گا۔ اِس کی حکمت انھوں نے یہ بتائی کہ اگر میں چرچ کے اندر نماز پڑھ لوں تو بعد کے زمانے کے مسلمان کہیں گے کہ یہاں ہمارے خلیفہ نے نماز پڑھی ہے، اِس لیے ہم یہاں مسجد بنائیں گے۔ اِس طرح یہاں چرچ اور مسجد کا جھگڑا کھڑا ہو جائے گا۔

بابری مسجد کے معاملے میں حضرت عمر کے مذکورہ نمونے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پہلی غلطی خود میر باقی نے کی۔ انھوں نے ہندوؤں کے مقدس استھان سے ملا کر مسجد بنائی۔ اِس طرح انھوں نے پہلے ہی دن اِس معاملے میں نزاع کی بنیاد رکھ دی۔

2- دسمبر 1949 میں جب بابری مسجد کے اندر تین مورتیاں رکھ دی گئیں، اُس وقت بھی مسلمانوں نے اِس معاملے میں اسلام کی تعلیمات سے رہنمائی حاصل نہیں کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مسئلہ بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ ناقابلِ حل مسئلہ بن گیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں جب توحید کا مشن شروع کیا، اُس وقت وہاں کی ابراہیمی مسجد کعبہ کے اندر مشرکین نے 360 بت رکھ دئے تھے۔ پیغمبر اسلام نے ان بتوں کی موجودگی سے اعراض فرمایا اور اپنی ساری کوشش وہاں کے انسانوں پر شروع کر دی۔ آپ نے کعبہ کی عمارت کے اندر سے بتوں کو نکالنے کے بجائے لوگوں کے دلوں سے بتوں کے نکالنے کو اپنا نشانہ بنایا۔ یہ طریقہ نہایت کامیاب ہوا، یہاں تک کہ 18 سال کی دعوتی کوشش کے بعد مکہ کے مشرکین نے بت پرستی کو ترک کر دیا اور خود کعبہ کی عمارت سے تمام بتوں کو ہٹا دیا۔ اِس کے برعکس، موجودہ زمانے کے مسلمان اِس پیغمبرانہ حکمت کو اختیار کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے۔ چناں چہ انھوں نے اِس معاملے میں ردّعمل کا طریقہ اختیار کیا جس کا نتیجہ صرف الٹی صورت میں برآمد ہوا۔

3 - ستمبر 1991 میں پی وی نرسمہا راؤ (وفات: 2004) ہندستان کے وزیر اعظم

تھے۔انھوں نے ہندستانی پارلیمنٹ سے ایک قانون منظور کرایا جس کا نام یہ تھا:

Places of Worship (Special Provisions) Act-1991

اِس قانون میں یہ متعین کیا گیا تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی یہ ذمے داری ہوگی کہ وہ ملک کے تمام عبادت خانوں کو اُس حالت پر برقرار رکھے جو کہ آزادی کے وقت 15 اگست 1947 میں ان کی حالت تھی۔ اِس قانون میں یہ کہا گیا تھا کہ چوں کہ بابری مسجد کا کیس عدالت میں ہے، اِس لیے اِس معاملے میں حکومت عدالتی فیصلے کا انتظار کرے گی اور فیصلہ آنے کے بعد اس کے مطابق، اس کی تعمیل کی جائے گی، لیکن مسلمانوں نے اِس ایکٹ کو نہیں مانا، انھوں نے اِس معاملے کو جلسہ جلوس کا معاملہ بنا دیا۔ اِس کے بعد فطری طور پر ہندوؤں میں جوابی ہنگامہ آرائی کا ذہن بنا، یہاں تک کہ ہندوؤں کے ایک پر جوش ہجوم نے 6 دسمبر 1992 کو اجودھیا میں داخل ہو کر بابری مسجد کو ڈھا دیا۔ اُس وقت میں نے کہا تھا کہ — بابری مسجد کو ہندوؤں نے توڑا، اور مسلمانوں نے اس کو تڑوایا۔

4- 30 ستمبر 2010 کو عدالت کا جو فیصلہ آیا ہے، مسلمان عام طور پر اس کو اپنے حق میں ناانصافی سمجھتے ہیں۔ ان کا رجحان یہ ہے کہ وہ اِس معاملے کو سپریم کورٹ میں لے جائیں اور وہاں سے منصفانہ فیصلہ حاصل کرنے کی کوشش کریں، مگر یہ طریقہ بابری مسجد کے مسئلے کو حل کرنے والا نہیں۔

اِس مسئلے میں سپریم کورٹ سے رجوع کرنے کی صورت میں بالفرض اگر ایسا ہو کہ سپریم کورٹ اِس کیس کا فیصلہ مسلمانوں کی موافقت میں کر دے، تب بھی ہندوؤں کے لیے مزید کارروائی کا دروازہ کھلا رہے گا۔ جیسا کہ معلوم ہے، شاہ بانو کیس (1985) میں سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ دیا تھا۔ یہ فیصلہ مسلمانوں کو اپنے خلاف نظر آیا اور انھوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ چناں چہ اس کے خلاف پورے ملک میں مسلمانوں کی طرف سے مظاہرے شروع ہو گئے، یہاں تک کہ اُس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی (وفات: 1991) کو پارلیمنٹ سے ایک نیا ایکٹ بنوانا پڑا۔ یہ دروازہ بلا شبہہ ہندوؤں کے لیے بھی کھلا ہوا ہے۔ وہ یہ کہہ کر سپریم کورٹ کے فیصلے کو رد کر سکتے ہیں کہ یہ فیصلہ ہمارے مذہبی جذبات کے خلاف ہے، اِس لیے ہم اس کو قبول نہیں کر سکتے۔

5- بابری مسجد کے معاملے میں اسلام اور دانش مندی دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ اب اِس معاملے میں کاما (comma) نہ لگایا جائے، بلکہ فل اسٹاپ (full stop) لگادیا جائے۔ دوسرا کوئی بھی طریقہ صرف مسئلے کومزید پیچیدہ کرے گا، وہ اِس مسئلے کوحل کرنے والانہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اب اِس معاملے میں مسلمانوں کے لیے عملاً ایک ہی ممکن انتخاب (option) باقی رہاہے اور وہ مسجد کا ری لوکیشن (re-location) ہے۔ یہ وہی طریقہ ہے جس کو پٹرول کے ظہور کے بعد عرب ملکوں میں بڑے پیمانے پر اختیار کیا گیا ہے، یعنی سٹی پلاننگ (city planning) کے لیے قدیم مسجدوں کوری لوکیٹ کرنا۔

موجودہ حالات کے اعتبار سے، اب مسلمانوں کے لیے عملاً صرف دو میں سے ایک کا انتخاب باقی رہ گیا ہے — یا تو وہ اس معاملے میں خود غیر جانب دار ہوکر مزید کارروائی کے لیے اس کو حکومت کے حوالے کردیں، جیسا کہ دوسرے عدالتی فیصلوں کے معاملے میں ہوتا ہے، یا اگر وہ چاہتے ہیں کہ بابری مسجد کو وہ ایک تاریخی یادگار کے طور پر باقی رکھیں تو وہ ایسا کرسکتے ہیں کہ وہ اس کے ری لوکیشن (re-location) پر راضی ہوجائیں، یعنی کسی دوسرے غیر نزاعی مقام پر اُسی شکل کی مسجد تعمیر کرنا۔ سابق مقام پر دوبارہ بابری مسجد کی تعمیر ایک ایسا غیر حقیقت پسندانہ تصور ہے جو کبھی واقعہ بننے والانہیں۔

6- اجودھیا کے متنازع مقام پر عدالتی فیصلہ آنے کے بعد عام طور پر مسلمان یہ کہہ رہے ہیں کہ اِس فیصلے میں ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ یہی موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا عام ذہن ہے۔ ہر جگہ مسلمانوں کو دوسرے فریق سے یہی شکایت ہے۔ مگر یہ شکایت یقینی طور پر غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ یہ شکایت صرف یہ بتاتی ہے کہ مسلمان معاملات کو صرف جذباتی اعتبار سے دیکھتے ہیں، نہ کہ عقل وفہم کے اعتبار سے۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ فرد اور اجتماع کے درمیان فرق کیا جائے۔ قرآن اور حدیث میں اِس بات کی سخت تاکید کی گئی ہے کہ فرد کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ انصاف کے راستے پر چلے، وہ اِس معاملے میں کسی چیز کو عذر (excuse) نہ بنائے۔ لیکن اجتماع کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ جب کسی اجتماعی معاملے میں دو فریقوں کے درمیان نزاع پیدا ہوجائے تو اُس وقت یہ ممکن نہیں ہوتا کہ

خالص نظری بنیاد (theoretical reason) پر ایسا فیصلہ کیا جائے جو دونوں فریقوں کو منصفانہ فیصلہ نظر آئے۔ ایسے موقع پر صرف یہی ممکن ہوتا ہے کہ عملی تقاضے (practical reason) کو دیکھا جائے اور عملی طور پر جو ممکن ہو، اس کے مطابق، فیصلہ کر دیا جائے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہت سی ایسی مثالیں ہیں جو اِس اصول کی تصدیق کرتی ہیں۔ آپ نے اجتماعی نزاع کے معاملے میں ہمیشہ عملی بنیاد پر فیصلہ کیا، نہ کہ نظری انصاف کی بنیاد پر۔ اِس معاملے کی ایک نمایاں مثال صلح حدیبیہ ہے۔

7- اگر نزاعی معاملے میں یہ صورت پیدا ہوجائے کہ اس میں تبدیلی ممکن نظر نہ آتی ہو، ایسی حالت میں عقل اور اسلام دونوں کا یہ تقاضا ہے کہ موجودہ صورت حال (status quo) کو مان کر مسئلے کو ختم کر دیا جائے۔ کیوں کہ کوئی نزاعی معاملہ جب اِس نوبت کو پہنچ جائے تو انتخاب (option) صحیح اور غلط کے درمیان نہیں ہوتا، بلکہ اُس وقت انتخاب ممکن اور ناممکن کے درمیان ہوجاتا ہے۔ ایسی حالت میں عقل اور اسلام دونوں کا یہ تقاضا ہے کہ ناممکن کے پیچھے مزید وقت ضائع نہ کیا جائے، بلکہ جو ممکن ہے اُس کو قبول کر لیا جائے۔ اِس کا فوری فائدہ یہ ہوگا کہ حالات نارمل ہوجائیں گے اور تعمیر وترقی کی سرگرمیاں کسی رکاوٹ کے بغیر جاری ہوجائیں گی۔

خلاصہ بحث

خلاصہ یہ کہ لمبی مدت کی ناکام جدوجہد کے بعد اب اجودھیا کا معاملہ نظر ثانی (reassessment) کا معاملہ بن چکا ہے۔ اب وہ وقت گزر چکا ہے جب کہ اُن تدبیروں کو دہرایا جائے جن کو اس سے پہلے بار بار بڑے پیمانے پر عمل میں لایا گیا، مگر وہ مکمل طور پر ناکام ثابت ہوا۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ 30 ستمبر 2010 کے پہلے کی تاریخ کو بھلا دیا جائے اور 30 ستمبر 2010 کے بعد سامنے آنے والے حقائق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ازسرِ نو اِس معاملے میں فل اسٹاپ لگا دیا جائے۔ اِس مسئلے میں مزید کا مالگانا، اب صرف اپنی تباہی میں اضافے کا باعث ہوگا، وہ کسی بھی درجے میں مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ اِس معاملے میں اب اگر کوئی کا مالگایا جائے تو وہ یقینی طور پر مسلمانوں کے احساسِ ناکامی میں احساسِ ذلت کے اضافے کے ہم معنی ہوگا، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

غیر دعوتی ذہن

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (5 اگست 2010) میں ایک خبر اِس عنوان کے تحت چھپی ہے۔ پاکستان کے ایک ہندو نوجوان کے تابوت پر ''کافر'' کا ٹیگ لگایا گیا:

Pak Hindu youth's coffine tagged 'Kafir'.

خبر میں بتایا گیا ہے کہ 28 جولائی 2010 کو پاکستان کا ایک ہوائی جہاز گر کر تباہ ہوگیا۔ اِس جہاز میں کُل 152 مسافر تھے، جو سب کے سب مر گئے۔ اِن مسافروں میں پاکستان کا ایک ہندو نوجوان پریم چند (25 سال) تھا۔ وہ بھی اِس حادثے میں ختم ہوگیا۔ مردہ لاشوں کا جب تابوت تیار کیا گیا تو اُن میں سے ایک تابوت مذکورہ ہندو نوجوان کا بھی تھا۔ عام اصول کے مطابق، اِس تابوت پر ہندو نوجوان کا صرف نام لکھنا چاہیے تھا، لیکن پیک کرنے والوں نے اس کے تابوت پر نمایاں حروف میں ''کافر'' لکھ دیا:

> The coffin of a promising young Pakistani Hindu social worker, killed in the recent airliner crash here, has been marked as 'kafir' or infidel, causing anguish and revulsion among his friends and netizens. Prem Chand, 25, a bright spark from the minority Hindu community, was a member of the National Youth Parliament and was heading to Islamabad from Karachi to attend the organisation's last session when the Airblue flight crashed into the Margallah Hills on July 28, killing all 152 people on board. Ehsan Naveed Irfan, a youth parliamentarian who identified Prem Chand's body, said the coffin was first marked in black with the word 'kafir' and this was then highlighted in red. (p. 13)

پاکستانی فضائیہ کے ذمے داروں کے اندر اگر انسانی ہمدردی کا جذبہ ہوتا تو وہ تابوت پر صرف ہندو نوجوان کا نام لکھتے۔ اور اگر ان کے اندر دعوتی جذبہ ہوتا تو وہ دردمندی کے ساتھ یہ سوچتے کہ ہمارے ملک کا ایک شخص کم عمری میں اس دنیا سے چلا گیا اور ہم یہ نہ کر سکے کہ اپنی ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے اُس کو خدا کا پیغام پہنچا دیں— کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جن کے اندر نہ انسانی ہمدردی ہے اور نہ دعوتی تڑپ۔ اِس کے باوجود وہ اپنے آپ کو اسلام کا سب سے بڑا نمائندہ سمجھتے ہیں۔

جذباتی قیادت

ایک پاکستانی مسلمان جو پروفیشن کے اعتبار سے ڈپلومیٹ (diplomate) تھے، انھوں نے ایک امریکن لڑکی سے شادی کی جو کہ کرسچن تھی۔ اس سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام داؤد (David Coleman Headley) تھا۔

جیسا کہ اس کے چچا نے بتایا، نوجوانی کی عمر تک ہیڈلی ایک معتدل اور امن پسند مسلمان تھا، لیکن بعد کو وہ بہت بڑا ملٹنٹ بن گیا۔ 26 نومبر 2008 کو بمبئی پر حملے کا وہی ماسٹر مائنڈ تھا۔ اس نے ڈنمارک کے کارٹونسٹ کے خلاف قاتلانہ حملے کا منصوبہ بنایا۔ اس کی اِن متشددانہ کارروائیوں میں سیکڑوں آدمی ہلاک ہوگئے، وغیرہ۔

داؤد ہیڈلی کس طرح ایک ملٹنٹ مسلمان بن گیا، اِس کا راز اُس نے خود اپنے اُس بیان میں بتایا جو اُس نے شکاگو کی امریکی عدالت میں دیا تھا۔ اِس بیان میں اُس نے کہا کہ — پاکستان کے شعلہ بار مقرر جو انڈیا کے خلاف نفرت سے بھری ہوئی تقریریں کرنے کے لیے مشہور ہیں، ان کی تقریریں سن کر میں ملٹنٹ بن گیا۔ اس نے خود یہ اعتراف کیا کہ وہ حافظ سعید کی تقریروں سے متاثر ہوا:

> Hafiz Mohammad Saeed the hate-spewing jihadi ideologue. But given that Headly has already acknowledged having been inspired by Saeed's anti-India rehetoric and his testimony about the involvement of Lashkar commanders in the Mumbai plot. (*The Times of India,* March 20, 2010)

یہ مثال موجودہ زمانے میں پوری امتِ مسلمہ کی تصویر ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے اندر ایسے جذباتی رہنما پیدا ہوئے جن کی پر شور خطابت (rhetoric) نے مسلمانوں کو دیوانہ بنا دیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو حدیث میں الشرارون (الترمذی، رقم الحدیث: 2018) کہا گیا ہے۔ یہی رہنما موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی تباہی کے اصل ذمے دار ہیں۔ رہنمائی کا کام صرف اُس شخص کو کرنا چاہیے جو غیر جذباتی انداز میں سوچے اور غیر جذباتی بنیادوں پر فیصلے لے سکے۔

نظریۂ ارتقاء پرشبہات

انڈونیشیا کے ایک جزیرے میں 2003 میں کسی قدیم انسان کا ایک متحجر ڈھانچہ (fossilized skeleton) ملا۔ ماہرین کی ایک انٹرنیشنل ٹیم نے گہرائی کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا۔ اِس مطالعے کے جو نتائج سامنے آئے ہیں، اُس سے معلوم ہوا کہ یہ ڈھانچہ 18 ہزار سال پرانا ہے۔ اِس مطالعے کا خلاصہ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (8 مارچ 2010) میں چھپا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ — یہ دریافت اچانک انسانی ارتقاء کے بارے میں سائنسی نظریات کے خلاف ایک بڑا چیلنج بن گئی ہے۔ انسانی ارتقاء کا عمل اُس سے زیادہ پیچیدہ ہے، جیسا کہ پہلے سمجھ لیا گیا تھا:

Almost overnight, the find threatened to change science's understanding of human evolution. It would mean contemplating the possibility that not all the answers to human evolution lie in Africa, and that human development was more complex than thought (p. 23)

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ دریافت نظریۂ ارتقاء کے لیے بڑا چیلنج (big challenge) نہیں، بلکہ یہ نظریہ ارتقاء کی ایک بڑی تردید ہے۔ اِس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی ارتقاء کا نظریہ اُس سے زیادہ پیچیدہ ہے جتنا کہ اس کو سمجھ لیا گیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کا واقعہ اِس سے زیادہ پیچیدہ ہے کہ نظریۂ ارتقاء کے ذریعہ اس کی توجیہہ ہوسکے:

Human development is complex enough
to be explained by the evolution theory.

حقیقت یہ ہے کہ ارتقاء کا نظریہ صرف ایک مفروضہ ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی علمی نظریہ۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان وہ صرف اِس لیے پھیل گیا کہ اُنھیں یہ نظر آیا کہ یہ اُن کے لیے ایک ورک ایبل (workable) نظریہ ہے۔ تاہم اِس نظریے کا ثابت شدہ واقعہ ہونا، ابھی تک اہلِ علم کے درمیان اختلافی مسئلہ بنا ہوا ہے۔

خاتمۂ تاریخ کا الارم

امریکا میں مطالعۂ فطرت کا ایک ادارہ ہے جس کو عام طور پر انٹرنیشنل تھنک ٹینک کہا جاتا ہے۔ اس ادارے کا اصل نام حسب ذیل ہے:

Global Footprint Network

اِس ادارے نے عالمی ریسرچ کے بعد بتایا ہے کہ کرۂ ارض تیزی کے ساتھ انسان کے لیے ناقابل رہائش (inhabitable) بنتا جارہا ہے، اِس لیے کہ موجودہ زمین کے ذرائع اُس معیارِ حیات کے لیے ناکافی ہیں جو جدید تہذیب کے ظہور کے بعد انسان نے اختیار کیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اگر زمین کے تمام باشندے امریکا کے معیارِ حیات پر زندگی گزارنا چاہیں تو آج ہی ہم کو موجودہ زمین جیسی پانچ زمین کی ضرورت ہوگی۔ اِسی طرح رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ دنیا میں ذرائع حیات اگر موجودہ صورتِ حال پر برقرار رہے، تب بھی موجودہ زمین کے ذرائع صرف 2030 تک کام آسکتے ہیں:

> Humans using resources at alarming rate- Humanity would need five earths to produce the resources needed, if everyone lived as profligately as Americans. We are demanding nature's services - resources and creating CO_2 emissions- at a rate 44% faster than what nature can regenerate and reabsorb. That means, it takes the Earth just under 18 months to produce the ecological services, humanity needs in one year. And if humankind continues to use natural resources and produce waste at the current rate, we will require the resources of two planets to meet our demands by the early 2030s, a gluttonous level of ecological spending that may cause major ecosystem collapse (*The Times of India,* New Delhi, November 25, 2009, p. 24)

یہ صورت حال بے حد الارمنگ (alarming) ہے۔ مذکورہ سائنسی رپورٹ قیامت کی پیشگی اطلاع کے ہم معنیٰ ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ لوگ بیدار ہوجائیں۔ لوگ اپنے آپ کو اِس قابل بنائیں کہ وہ محفوظ طور پر قیامت کا سامنا کرسکیں۔ اِس بیداری کا تعلق مسلمانوں سے بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ اُس کا تعلق غیر مسلموں سے ہے۔

قیامت قریب آگئی

ایس سی اے آر (Scientific Committee on Antarctic Research) کی ایک سروے رپورٹ میڈیا میں شائع ہوئی ہے۔ تیرہ ملکوں کے ایک سو انٹرنیشنل سائنس دانوں کے گروپ نے یہ سروے کیا ہے۔ اِس سروے میں بتایا گیا ہے کہ برف کے ذخائر (گلیشئر) کے پگھلنے سے سمندروں میں پانی کی سطح بڑھ رہی ہے۔ اکیسویں صدی عیسوی کے خاتمے تک سطحِ آب کا یہ اضافہ چار فٹ سے زیادہ ہوجائے گا۔ اگر یہ اندازہ درست ثابت ہوتا ہے تو بہت سے سرحدی علاقے زیرآب ہوجائیں گے۔ مثلاً مالدیپ، ممبئی، مدراس اور کلکتہ، وغیرہ:

> Rise in sea levels could be double of estimates — a major study by a group of 100 international scientist has said that sea levels are likely to rise by as much as 1.4 metres (more than 4 feet) by the end of this century. If these projections come true, most low-lying island nations like the Maldive would go under the sea. The New study also significantly enhances the threat to the Indian coasts — and cities like Mumbai, Chennai and Kolkata. (*The Times of India,* New Delhi, December 2009, p. 1)

حدیث میں قیامت کی جو پیشین گوئیاں بتائی گئی ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ زمین پر پانی کی سطح بلند ہوجائے گی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سطحِ آب میں اضافے کا یہ عمل تیزی سے شروع ہوچکا ہے۔ سائنس داں یہ بھی مانتے ہیں کہ اِس عمل کو روکنا، انسان کے بس سے باہر ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ انسان توبہ اور انابت میں اضافہ کرے۔ فطرت کے اِس عمل کو روکنے کے لیے کانفرنسیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

تمام قرائن یہ بتا رہے ہیں کہ موجودہ زمین پر انسان کی تاریخ اب خاتمہ کے قریب پہنچ گئی۔ چناں چہ سائنس داں انسانی نسل کی بقا کے لیے زمین جیسے ایک اور کرہ کی تلاش میں ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وسیع خلا میں زمین جیسا کوئی اور کرہ موجود نہیں۔

سننے کی عادت ڈالیے

تجربہ بتاتا ہے کہ ملاقات کے وقت اکثر لوگ صرف اپنی بات سناتے رہتے ہیں، وہ دوسرے کی بات سننے کے حریص نہیں ہوتے۔ یہ بہت بڑی کمزوری ہے۔ اِس کمزوری کا براہِ راست نقصان خود زیادہ بولنے والے کے حصہ میں آتا ہے، اور وہ یہ کہ اس کا ذہنی ارتقا نہیں ہوتا۔

بسیار گوئی کی بنا پر یہ ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کے اندر ذہنی ارتقا کا عمل جاری نہیں ہوتا۔ ایسے آدمی کا یقینی انجام یہ ہے کہ وہ ذہنی جمود (intellectual stagnation) کا شکار ہو کر رہ جائے۔

کسی نے درست طور پر کہا ہے کہ — جب میں بولتا ہوں تو میں سوچ نہیں رہا ہوں:

When I am speaking, I am not thinking.

ذہنی ارتقا کا تعلق تمام تر سوچ پر ہے۔ زیادہ بولنا، آدمی کے ذہن میں سوچنے کے عمل کو روک دیتا ہے، اور جس آدمی کے اندر سوچنے کا عمل رک جائے، اُس کا یہ حال ہوگا کہ وہ فکری اعتبار سے جہاں پہلے تھا، وہیں وہ بعد کے زمانے میں بھی باقی رہے گا۔

ہر آدمی کا الگ الگ میدان ہوتا ہے، ہر آدمی مختلف قسم کے تجربات سے گزرتا رہتا ہے۔ اِس بنا پر ہر آدمی کے پاس کچھ ایسی بات ہوتی ہے جو دوسرے کے پاس نہیں ہوتی۔

اِس لیے جب بھی آپ کسی شخص سے ملیں تو آپ پیشگی طور پر یہ یقین کر لیجیے کہ اس کے پاس کوئی نئی بات ہوگی۔ اِس لیے سب سے پہلے چپ رہ کر اس کی بات سنئے۔ اس کے تجربات پوچھ کر اپنے علم میں اضافہ کیجئے۔

یہی ملاقات کا واحد صحیح طریقہ ہے۔ آج کل ہر آدمی سنانے کا ماہر بنا ہوا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ سننے کے عادی بنیں۔ سنانا بھی ایک عادت ہے اور سننا بھی ایک عادت۔ بہتر یہ ہے کہ آپ سننے کی عادت ڈالیں، نہ کہ صرف سنانے کے عادی بنے رہیں۔ سننے کی عادت صحت کی علامت ہے اور سنانے کی عادت بیماری کی علامت۔

نادانی کی چھلانگ

19 فروری 2010 کے اخبارات میں ایک انوکھی خبر تھی۔ خبر کے مطابق، امریکا کے ایک 53 سالہ شخص جوزیف (Joseph Andrew Stack) نے امریکا کے شہر آسٹن (Texas) میں اپنا چھوٹا جہاز اڑایا اور اس کو لے جا کر فیڈرل ٹیکس آفس (federal tax office) کی سات منزلہ بلڈنگ کے دوسرے فلور سے ٹکرا دیا۔ اس کے بعد جو واقعہ ہوا، اس کو بلڈنگ کے ایک شخص نے اِن الفاظ میں بیان کیا:

It was almost like an earthquake.

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ امریکی شخص نے جس جہاز کو بلڈنگ سے ٹکرا کر خودکشی کی، وہ کوئی مسافر بردار جہاز نہ تھا، بلکہ وہ اُس کا اپنا ذاتی جہاز تھا:

The plane belonged to Joseph Andrew Stack.
(*The Guardian,* February. 18, 2010)

جس امریکی شخص نے خودکشی کی، وہ کوئی غریب آدمی نہ تھا۔ اس کے پاس اپنا ذاتی جہاز تھا، اور اِسی کی نسبت سے یقینی طور پر دوسری بہت سی چیزیں اس کو ملی ہوئی تھیں۔ اِس کے باوجود اس نے کیوں خودکشی کرلی۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ اُس کو موت سے پہلے کے مسئلے کی خبر تھی، لیکن اُس کو موت کے بعد کے مسئلے کی خبر نہ تھی۔ اگر وہ اِس حقیقت کو جانتا تو وہ ہرگز خودکشی نہ کرتا۔

کہا جاتا ہے کہ مذکورہ امریکی شخص ٹیکس کے مسائل سے پریشان تھا اور اِس بنا پر اس نے خودکشی کرلی۔ لیکن ٹیکس کا مسئلہ بہر حال ایک چھوٹا مسئلہ تھا، جب کہ خودکشی کے بعد پیش آنے والا مسئلہ یقینی طور پر اس کے لیے ایک بڑے مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر وہ اِس حقیقت کو جانتا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا کہ ایک چھوٹے مسئلے سے گھبرا کر بڑے مسئلے کی طرف چھلانگ لگا دے — یہی نادانی آج تمام لوگ کررہے ہیں، کوئی ایک صورت میں کر رہا ہے اور کوئی دوسری صورت میں۔

خودکشی حرام کیوں

یکم اکتوبر 2009 کا واقعہ ہے۔تھنّہ منڈی (جموں وکشمیر) کے علاقے میں ایک گاؤں کے اندر ایک واقعہ ہوا۔ایک ملٹنٹ کمانڈر اپنے دوساتھیوں کے ہم راہ رات کے وقت ایک گھر میں داخل ہوا۔اِن لوگوں نے گھر کے مرداور عورت کو اتنا زیادہ مارا کہ وہ بے ہوش ہوکر گر پڑے۔اُن کو شک تھا کہ یہ لوگ مخبری کا کام کرتے ہیں۔ان کی 18 سالہ لڑکی رخسانہ اُس وقت گھر کے اندر موجود تھی۔وہ اِس منظر کو دیکھ نہ سکی۔اس نے فوراً ایک کلہاڑی لے کر پہلے ملٹنٹ کمانڈر کو مار کر گرادیا۔اس کے بعد تیزی سے اس کی گن چھین کر اُسی گن سے اس کے اوپر کئی فائر کیے۔ملٹنٹ کمانڈر اسی وقت ہلاک ہوگیا اوراس کے دونوں ساتھی اس کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔

اِس واقعے میں بہت بڑا سبق ہے۔انسانی دماغ کے اندر غیر معمولی توانائی موجود ہے، عام حالات میں وہ غیر متحرک رہتی ہے،لیکن جب کوئی شدید جھٹکا لگتا ہےتو دماغ کے اندر موجود یہ توانائی فی الفور جاگ اٹھتی ہےاور ایک لمحے کے اندر آدمی کو ہیرو بنادیتی ہے۔

مذکورہ لڑکی کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔اس کے والدین کے ساتھ جو ہولناک معاملہ پیش آیا، اس نے اس کے دماغ کے بند خانوں کو کھول دیا۔ایک لمحے کے اندر اُس نے ناقابلِ تسخیر پلاننگ کی، چناں چہ اس نے پہلے کلہاڑی کے ذریعے کمانڈر کو مغلوب کیا اس کے بعد بجلی جیسی تیزی کے ساتھ کمانڈر کی گن کو چھینا اور فی الفور گن چلا کر اس کا خاتمہ کردیا۔

اِس موقع پر لڑکی اگر خودکشی کرلیتی تو وہ اِس بہادرانہ کارنامے کو انجام دینے سے محروم رہ جاتی۔ خودکشی کو اسلامی شریعت میں اِس لیے حرام کیا گیا ہے، تاکہ انسان کی زندگی کو بچایا جائے اور اس کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ زندہ رہ کر مستقبل میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دے سکے:

It is to save a life, so that he may play a greater role in future.

ڈکشنری کافی نہیں

اگر آپ گہرا علم نہیں رکھتے اور صرف ڈکشنری کی مدد سے قرآن کو پڑھنا چاہتے ہیں تو یقین ہے کہ آپ غلطیاں کریں گے۔ گہرے علم کے بغیر آدمی صرف ڈکشنری یا لغت کی مدد سے نہ قرآن کو سمجھ سکتا، نہ کسی اور کتاب کو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ الفاظ کے معانی اس کے سیاق (context) سے متعین ہوتے ہیں۔ اِسی طرح ہر لفظ کا ایک لغوی مفہوم ہوتا ہے، اور ایک اس کا استعمالی مفہوم۔ اِسی طرح صِلہ (preposition) کے فرق سے بھی الفاظ کے معانی بدل جاتے ہیں۔ جو لوگ اِس طرح کی بصیرت نہ رکھتے ہوں، وہ کسی کتاب کو درست طور پر نہیں سمجھ سکتے۔

مثلاً انگریزی کی مثال لیجیے۔ کسی گھر میں آگ لگ جائے تو کہا جائے گا:

The house caught fire.

اِس جملے میں فائر (fire) کے معنی آگ کے ہیں۔ دوسری طرف، اگر کسی آدمی کو سروس سے برخاست کر دیا جائے تو کہا جائے گا:

He was fired.

اِس جملے میں ’’فائر‘‘ کے معنی آگ کے نہیں ہیں اور نہ گولی مارنے کے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی سروس ختم کر دی گئی ہے۔ الفاظ کا یہ فرق صرف گہرے علم کے بعد آدمی کو حاصل ہوتا ہے۔ یہی معاملہ قرآن کا ہے۔ مثلاً قرآن کی ایک آیت ہے: أقیموا الدین (42:13) اِس آیت کا لفظی ترجمہ ہے: دین کو قائم کرو۔ جو آدمی صرف لغت کو جانتا ہو اور اس کے اندر علمی بصیرت نہ ہو، وہ اِس کا مطلب یہ لے لے گا کہ دین کو غالب کرو، شرعی احکام کو نافذ کرو، حالاں کہ آیت کا یہ مطلب نہیں۔ اِس آیت میں دین کی اقامت کا مطلب دین کی پیروی کرنا ہے، نہ کہ دین کو خارجی دنیا میں نافذ کرنا۔ جو آدمی گہری علمی بصیرت نہ رکھتا ہو، اُس کو چاہیے کہ وہ کسی کو اپنا رہنما بنا لے۔ وہ اُس پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی نصیحت پر عمل کرے، نہ یہ کہ وہ اپنا رہنما آپ بن جائے۔

سوال و جواب

سوال

9 اکتوبر 2010 کو نئی دہلی کے اردو اخبار ''راشٹریہ سہارا'' میں بابری مسجد کے موضوع پر آپ کا ایک مضمون شائع ہوا۔ اِس مضمون کو دیکھنے کے بعد دو مسلمانوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ اِس طرح تھی۔ ایک نے کہا: کیا مولانا نے بابری مسجد ہندوؤں کو دے دی۔ دوسرے مسلمان نے جواب دیا: وہ تو بہت پہلے دے چکے ہیں۔ براہِ کرم، اِس تبصرہ پر روشنی ڈالیے۔ (محمد شارق، نئی دہلی)

جواب

یہ تبصرہ محض بے شعوری کا ثبوت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام مسلمان بابری مسجد کو عملاً چھوڑ چکے ہیں، بابری مسجد اب اُن کا حقیقی کنسرن (concern) نہیں۔ اب ہر مسلمان، بشمول مذکورہ تبصرہ نگار، مکمل طور پر مادّی ترقی کو حاصل کرنے میں مشغول ہے۔ وہ اگر بابری مسجد کا ذکر کرتا ہے تو وہ صرف لپ سروس(lip service) کے طور پر ہوتا ہے۔

اِس حقیقت پر غور کیجئے تو راقم الحروف اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان جو فرق ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ میں نے بابری مسجد کو دے دیا اور بقیہ مسلمانوں نے نہیں دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ''دینے'' کے واقعے کا تعلق دونوں طرف سے ہے، فرق صرف یہ ہے کہ میں نے اِس معاملے میں جو رویہ اختیار کیا ہے، وہ شعوری طور پر ایک اصول کے تحت اختیار کیا ہے، جب کہ دوسرے مسلمانوں نے اپنا رویہ ذاتی انٹرسٹ (مفاد) کے تحت بنایا ہے، یعنی زبانی طور پر بابری مسجد کا نام لینا اور عملاً اُس سے پوری طرح غیر متعلق ہو کر اپنے دنیوی بہبود کے لیے مصروف رہنا۔

مزید یہ کہ راقم الحروف نے کبھی وہ لفظ استعمال نہیں کیا جو مذکورہ تبصرہ میں میری طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اگر کسی کو اِس معاملے میں میرا نقطہ نظر بتانا ہے تو اس کو خود میرا لفظ استعمال کرنا چاہیے، نہ کہ اپنا لفظ۔ 6 دسمبر 1992 کو میں نے جو کچھ کہا تھا، وہ یہ تھا — ایک مسجد پر مسلمان چپ ہو جائیں، اور ایک کے بعد دوسری مسجدوں پر ہندو چپ ہو جائیں۔ اُس وقت تمام مسلمان اِس پر غصہ ہو گئے تھے، لیکن آج حالات کے

دباؤ کے تحت، تمام مسلمان اس کو عملاً اختیار کر چکے ہیں۔ اِس دنیا کا قانون یہ ہے کہ اگر آپ ایک بات کو اصول کے تحت نہ مانیں تو آپ کو اُسے دباؤ کے تحت ماننا پڑے گا، اور اِسی کا دوسرا نام منافقت ہے۔

بابری مسجد کے معاملے میں دوسرے لوگ جو رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے صرف منافقت ہے، نہ کہ اصول پسندی۔ جو آدمی بابری مسجد کے منہدم کئے جانے کے واقعے کو ظلم کا معاملہ سمجھتا ہے، اُس کو جاننا چاہیے کہ اِس معاملے میں صرف الفاظ بولنا کافی نہیں ہے، بلکہ اُس کو ''مجاہد'' بن کر اجودھیا پہنچ جانا چاہیے۔ اپنے کاروبار میں مشغول رہتے ہوئے صرف زبان سے مذکورہ قسم کے الفاظ بولنا، واضح طور پر منافقانہ رویہ ہے اور منافقت سے زیادہ بُری کوئی چیز اسلام میں نہیں (4:145)۔ اِس قسم کی بولی بلاشبہہ منافقانہ بولی ہے، نہ کہ مومنانہ بولی۔

سوال

آج ساری دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے جذبات ابھارے جارہے ہیں۔ کہیں کارٹون بنانے کے واقعات پیش آرہے ہیں تو کہیں قرآن کریم کی بے حرمتی کی جارہی ہے۔ ایسی صورت میں امتِ مسلمہ کا کیا رول ہونا چاہیے (جیسا کہ ظلم وستم کو روکنے کا حکم ہے اور نہ روک سکیں تو دعا کرنے کا حکم) برائے مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں، جیسا کہ آپ کرتے ہیں۔ یہ بتائیں کہ مسلمان روکنے کی پوزیشن میں ہیں یا صرف دعا کرنے کی پوزیشن میں۔ آپ کی بات اور آپ کا انداز سب سے جدا ہے اور مجھے مطمئن کرنے والا ہوتا ہے۔ (حماد احمد، نئی دہلی)

جواب

یہ کہنا درست نہیں کہ مسلمانوں کے جذبات ابھارے جارہے ہیں، یا اُن کو مشتعل کیا جارہا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ مسلمان بعض واقعات پر غیر ضروری طور پر مشتعل ہورہے ہیں، وہ غیر ضروری طور پر ان واقعات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ قرآن اور حدیث میں صبر وتحمل پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے، حتی کہ نماز سے پہلے صبر کا حکم ہے: **استعینوا بالصبر والصلاۃ** (2:45)۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ نماز تو دھوم سے پڑھتے ہیں، لیکن وہ صبر کو پوری طرح چھوڑے ہوئے ہیں۔

اِس مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمان خود اپنے رویے کو بدلیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ اِس معاملے میں مسلمان کیا کریں، وہ اِن واقعات کو روکیں یا وہ اُس کے لیے دعا کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس معاملے میں مسلمانوں کو خود اپنے آپ کو روکنا ہے اور خود اپنے لیے دعا کرنا ہے۔ کارٹون کا واقعہ یا قرآن کی بے حرمتی جیسی خبریں سن کر بھڑک اٹھنا، یہی مسلمانوں کی اصل غلطی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ جب وہ ایسی کوئی خبر سنیں تو وہ فوراً متعلق افراد سے ملیں اور اُن کو اسلامی لٹریچر پڑھنے کے لیے دیں۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا میں ہر انسان کو مصلحتِ امتحان کی بنا پر آزادی دی ہے۔ مذکورہ قسم کا کوئی واقعہ خدا کی دی ہوئی آزادی کا صرف ایک غلط استعمال ہوتا ہے۔ چوں کہ آپ آزادی کو ختم نہیں کرسکتے، اس لیے اُس کے خلاف لڑنا بھی آپ کے لیے درست نہیں۔ آپ صرف یہ کرسکتے ہیں کہ تبلیغ ونصیحت کے ذریعے اُس آدمی کی سوچ کو بدلیں، اسلام کے صحیح تعارف کے ذریعے اُس کے ذہن کو درست کریں اور اس کی اصلاح کے لیے اللہ سے دعا کریں۔

خبرنامہ اسلامی مرکز— 207

1- پستک میلہ سمیتی (نئی دہلی) کی جانب سے مدھیہ پردیش کے تاریخی شہر گوالیار میں 60واں نیشنل بک فئر منعقد ہوا۔ یہ بک فئر 4 اگست 2010 سے 9 اگست 2010 تک جاری رہا۔ اِس میں گڈ ورڈ بکس (نئی دہلی) نے حصہ لیا۔ یہاں یہ واحد اسلامک اسٹال تھا۔ لوگ بڑی تعداد میں اسٹال پر آئے اور صدر اسلامی مرکز کا ہندی اور انگریزی ترجمہ قرآن حاصل کیا۔ مقامی اخبارات نے اس کی خبریں شائع کیں۔ ہندی اخبار ''پریوار ٹوڈے'' (6 اگست 2010) نے صدر اسلامی مرکز کے کام کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

> मौलाना वहीदुद्दीन खान पुस्तकों के माध्यम से पिछले पचास वर्ष से शान्ति और भाईचारे का संदेश दे रहे हैं।

2- اگست۔ستمبر 2010 (رمضان 1431 ہجری) میں جنوبی ہند کا سفر ہوا۔ یہ سفر 20 اگست 2010 کو شروع ہوا اور 5 ستمبر 2010 کو ختم ہوا۔ آندھرا پردیش کے حیدر آباد، محبوب نگر، کریم نگر اور ریاست کرناٹک کے شہر گل برگہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے پاس ماہ نامہ الرسالہ کے 2000 شمارے اور ''صوم رمضان'' کی 8000 کاپیاں تھیں جو وہاں کے تعلیم یافتہ افراد کے درمیان تقسیم کی گئیں۔ الرسالہ مشن سے وابستہ مقامی لوگوں نے اپنا بھرپور تعاون دیا۔ کافی لوگ الرسالہ کے ممبر بنے اور پرانے ممبروں نے اپنی خریداری کی تجدید کی۔

3- پستک میلہ سمیتی (نئی دہلی) کی جانب سے مہاراشٹر کے تاریخی شہر ناگ پور میں 62واں نیشنل بک فئر منعقد ہوا۔ یہ بک فئر 24 ستمبر 2010 سے 3 اکتوبر 2010 تک جاری رہا۔ اس میں گڈ ورڈ بکس نے حصہ لیا۔ یہاں یہ واحد اسلامک اسٹال تھا۔ دعوتی اعتبار سے یہ بک فئر بہت کامیاب رہا۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے یہاں سے اسلامی مرکز کی کتابیں اور ہندی اور انگریزی ترجمہ قرآن حاصل کیا۔ بک فئر کے دوران 27 اگست 2010 کو ''سمّان سماروہ'' ہوا۔ پستک میلہ سمیتی کی طرف سے شہر ناگپور کے 16 لوگوں کو مختلف فیلڈ (لٹریچر وصحافت) میں نمایاں کام کرنے پر ایوارڈ دیا گیا۔ اِس موقع پر سبھی شرکاء کو خاص طور پر بک فئر کے سکریٹری چندر بھوشن اور سابق یونین منسٹر اور ایم پی مسٹر ولاس روا (Vilasroa Muttemwar) کو ہندی ترجمہ قرآن کی ایک ایک کاپی دی گئی۔ (شاہ عمران حسن)

4- فرینکفرٹ (جرمنی) میں 10-6 ستمبر 2010 ایک انٹرنیشنل بک فئر ہوا۔ اس میں گڈ ورڈ بکس نے شرکت کی۔ یہاں صدر اسلامی مرکز کی کتاب ''پرافٹ آف پیس'' کو تین انٹرنیشنل پبلشرز نے مختلف زبانوں— جرمن، فرنچ، مَلے میں شائع کرنے کا وعدہ کیا۔ اس موقع پر حاضرین کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔

5- دوردرشن (نئی دہلی) کے نیشنل چینل کے تحت اس کے آڈی ٹوریم میں 25 ستمبر 2010 کو ایک پروگرام ہوا۔ یہ پروگرام 2 اکتوبر کی نسبت سے مہاتما گاندھی کے بارے میں تھا۔ اس کا موضوع یہ تھا:

Non-violence and Relevance of Gandhian Principles.

یہ ایک پینل ڈسکشن تھا۔ اِس میں ٹاپ کے پینلسٹ شامل تھے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اِس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔ اِس موقع پر سی پی ایس کی طرف سے شرکاء کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور ''پرافٹ آف پیس'' مطالعے کے لیے دی گئی جس کو لوگوں نے بہت شوق سے لیا۔

6- نئی دہلی کے اسٹار ٹی وی اور این ڈی ٹی وی نیز کئی اخباروں نے 30 ستمبر 2010 کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو بابری مسجد کے حالیہ فیصلے کے بارے میں تھا۔ اِس میں بتایا گیا کہ عدالت کا فیصلہ آنے کے بعد مسلمان اب معاملے کو حکومت کے حوالے کردیں، تاکہ باہمی امن قائم ہو اور تعمیری کاموں کے مواقع کھل جائیں۔

7- بابری مسجد ورڈکٹ (30 ستمبر 2010) کے بعد صدر اسلامی مرکز نے اس موضوع پر ایک مضمون تیار کیا جو اِس شمارے میں موجود ہے۔ یہ مضمون نئی دہلی کے اردو اخبار ''راشٹریہ سہارا'' (8 اکتوبر 2010) اور ٹائمس آف انڈیا (12 اکتوبر 2010) میں شائع ہوا۔ ہندو مسلم دونوں طبقے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سنجیدہ لوگوں میں اس کو بے حد پسند کیا گیا۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کا دعوتی فکر اب وقت کی آواز بن چکا ہے۔ اِس سلسلے میں لوگوں نے بڑے پیمانے پر اپنے تاثرات بھیجے۔ یہاں صرف دو تاثر نقل کیے جا رہے ہیں:

- The article is very well written. Maulana’s solution alone will lead to peace between the two communities and put an end to this issue. (Swami Nikhilananda, New Delhi)

- This is to convey my appreciation of your fine essay, 'Babri Masjid Revisited' in 'The Times of India' of 12 October 2010.(Vasumathi Krishnasami, Bangalore)

8- امریکا کے لیے 2 اکتوبر 2010 کی صبح کو صدر اسلامی مرکز نے ایک خطاب کیا۔ اِس کو ٹیلی کانفرنسنگ کے ذریعے امریکا کے مختلف شہروں میں سنا گیا۔ یہ ایک گھنٹہ کا خطاب تھا جو انگریزی زبان میں ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا:

Establishing contact with God.

خطاب کے بعد سوال و جواب کا پروگرام ہوا۔ یہ پروگرام آدھ گھنٹے تک جاری رہا۔

9- جیسا کہ معلوم ہے، سی پی ایس انٹرنیشنل کے تحت 3-2 اپریل 2010 کو نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں الرسالہ مشن کے ممبران کا ایک دعوتی اجتماع (Dawah Meet) ہوا تھا۔ اِس اجتماع سے غیر معمولی طور پر دعوتی اور تربیتی فائدہ ہوا۔ اِس میں بہت سے ایسے افراد تھے جو الرسالہ مشن کے تحت لمبی مدت سے عملاً دعوتی کام کر رہے ہیں، مگر انھوں نے کبھی صاحبِ مشن (مولانا وحید الدین خاں صاحب) سے براہِ راست ملاقات نہیں کی تھی۔ اس کے باعث ان کے ذہن میں مختلف قسم کے سوالات تھے۔ اجتماع میں شرکت کے بعد انھوں نے بتایا کہ مولانا کو دیکھ کر ہی ہمارے تمام سوالات ختم ہو گئے اور دعوت کی نئی اسپرٹ ہمارے اندر پیدا ہو گئی۔ اِس سلسلے میں مختلف ساتھیوں کے کچھ تاثرات

مختصراً یہاں اردو اور انگریزی زبان میں نقل کئے جاتے ہیں:

● دعوہ میٹ واقعی معنوں میں Angels Meet تھی۔ اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام جس درد و کرب کے ساتھ الرسالہ مشن سے وابستہ یہ افراد پہنچا رہے ہیں، وہ صحابہ کے دور کی یاد دلاتا ہے۔ دعوت الی اللہ کے میدان میں بیش بہا قربانیوں کے باوجود ان کو کوئی فخر نہیں، بلکہ احساس ذمہ داری سے ان کی آنکھیں نم تھیں۔ اہلِ جنت کی یہی نشانی ہے— ایمان باللہ، عمل صالح اور تواضع۔ اِس مجلس میں کلمہ شہادت کو پہلی بار شعوری طور پر مولانا کے ساتھ تجدید کرنے کا تاریخی موقع نصیب ہوا۔ مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ یہ منظر دل دہلا دینے والا تھا۔ ہر آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے اور وجود لرز رہا تھا۔ مولانا نے جب روتے ہوئے کہا: ''اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں، میری ہڈیاں پگھل چکی ہیں''، تو میرے ایک ساتھی نے مجھ سے کہا کہ اِس بوڑھے آدمی نے اپنی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کاندھوں سے اتار کر ہم پر ڈال دیا ہے۔ یہ احساس مجھ پر اس قدر غالب رہا کہ میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ Dawah Meet نے مجھے وادی کشمیر میں میر سید علی ہمدانی کے دعوتی مشن کو دوبارہ زندہ کر کے اسے عالمی سطح تک پہنچانے کے عزائم دئے۔ میٹنگ کے بعد جب ہم واپس لوٹ رہے تھے تو نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر ایک جاپانی خاتون (Yukie Matsuoka) سے دلچسپ انٹریکشن ہوا۔ میں نے خاتون کو قرآن کا انگریزی ترجمہ gift کیا۔ اس کو سینے سے لگا کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی: ''This is for me!'' جیسے ایک ماں اپنے کھوئے ہوئے بچے کو پا کر خوشی اور مسرت کا اظہار کرتی ہے۔ میرے ساتھی اشک بار آنکھوں سے کہہ رہے تھے: ''ہم مجرم ہیں، ہم مجرم ہیں'' (حمید اللہ حمید، ایم اے، بیروہ، کشمیر)

● دعوہ میٹ میں مولانا وحید الدین خاں صاحب نے اپنی خصوصی تقریر کے آغاز میں کہا کہ یہ دعوہ کانفرنس سادہ معنوں میں صرف الرسالہ ریڈرس کی کانفرنس نہیں ہے، بلکہ وہ الرسالہ اینجلس (angels) کی کانفرنس ہے۔ اِس تاریخی اجلاس نے بلا تشبیہ حجۃ الوداع کی یاد تازہ کر دی۔ مولانا نے بتایا کہ انھوں نے ساٹھ سال پہلے ایک تنظیم جس کا نام ''انصار اللہ'' تھا، قائم کیا تھا۔ اِس ٹیم میں اس وقت صرف مولانا اکیلے تھے۔ آج ساٹھ سال کی مسلسل محنت اور دعاؤں کے نتیجے میں انتہائی سنجیدہ اور باشعور لوگوں کی ایک طاقت ور ٹیم وجود میں آ چکی ہے۔ مولانا نے حاضرین کانفرنس سے یہ امید ظاہر کی کہ یہ ٹیم اخوان رسول کی مانند ادخالِ قرآن جیسے عظیم ترین کام کو بخوبی طور پر انجام دے گی۔ مولانا نے مزید کہا کہ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں، ساٹھ سال کی مسلسل محنت کے بعد میری ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میں جلد ہی اپنے رب کے پاس چلا جاؤں، لیکن آپ لوگوں کو آخری سانس تک اپنے آپ کو اس مشن سے وابستہ رکھنا ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اِس سچے مشن کو پانا سچ مچ خدائی مدد ہے۔ یہی وہ مشن ہے جس کی مدد کا خدا نے وعدہ کیا ہے۔ ٹیم کے ہر ممبر کے چہرے پر روحانیت اور سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ بیش تر حاضرین اس موقع پر اپنے آنسو روک نہیں پا رہے تھے۔ میرے ساتھ بھی کچھ یہی روحانی احساس گزرا۔ میں نے 11 جنوری 2006 کو عرفات کے میدان میں خدا کے سامنے حاضری دی تھی۔ وہی ربانی کیفیت ہمیں آج یہاں محسوس ہو رہی تھی۔ صاحب مشن کے

ساتھ ہم ایک لامحدود روحانی دریا میں نہا رہے تھے، ایسا محسوس ہورہا تھا، جیسے ہم فرشتوں کی صحبت میں بیٹھے ہوئے ہوں، جیسے ہم خداوند ذوالجلال کی ابدی رحمتوں کے سائے میں آگئے ہوں۔ (ڈاکٹر محمد اسلم خان، سہارن پور)

● دعوہ میٹ ایک عجیب اجتماع تھا۔ میں نے بہت سے مسلم اور غیر مسلم اجتماع میں شرکت کی ہے۔ مگر مذکورہ اجتماع کا پورا ماحول اور وہ کیفیتیں جو شرکاء پر طاری تھیں، اس کو میری آنکھوں نے نہ کبھی دیکھا اور نہ میرے جیسے انسان کے لیے اُس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہے۔ یہ واحد اجتماع تھا جس میں ہر طرف میں نے صرف اللہ کی عظمت کا چرچا سنا، اللہ کی عظمت کے سوا دوسری کسی عظمت سے یہ اجتماع مکمل طور پر خالی تھا۔ یہ اجتماع غیر معمولی طور پر اثر انگیز تھا۔ سارے لوگ تڑپ رہے تھے اور رو رہے تھے، اس فکر میں کہ کیسے تمام انسانوں تک خدا کا کلام (قرآن) پہنچادیا جائے۔ خود صدر اسلامی مرکز کا حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے، جسم کانپ رہا تھا، اس احساس میں کہ ''ہم سب سے بڑے ظالم ہیں، کیوں کہ ہم نے انسانوں سے ان کی جنت چھین رکھی ہے''۔ اس اجتماع میں جن چیزوں نے مجھے ششدر کر دیا، اس میں ایک دہلی سی پی ایس ٹیم کی تواضع (modesty) تھی۔ ڈاکٹر فریدہ خانم، ڈاکٹر ثانی اثنین خاں، مولانا محمد ذکوان ندوی، نغمہ صدیقی، استتھی ملہوترا، رجت ملہوترا، نودیپ کپور، وغیرہ ایسے انسان ہیں جنھوں نے اپنی انا کو کچل دیا ہے۔ میری زندگی میں یہ پہلا اجتماع تھا جس میں چیئر کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، جس میں خود منتظمین کے بڑے اور اہم افراد زمین پر اور سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ خود مولانا صاحب راؤنڈ میز کی ایک کامن چیئر پر بیٹھے ہوئے تھے اور لوگوں کے دعوتی تجربات سن رہے تھے، اس طرح جیسے لوگ اُن کو گہرا علم دے رہے ہوں۔ کوئی شخص جس نے مولانا کو کبھی نہ دیکھا ہو، وہ یقیناً اس روز مولانا کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ یہ بلا شبہہ الرسالہ اور مولانا کی تربیت کا ثمرہ ہے جس نے سی پی ایس دہلی کی ٹیم کو متواضع (modest) بامقصد اور بے غرض بنا دیا ہے۔ ایک دوسرا واقعہ جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، وہ اِس اجتماع میں علماء کی موجودگی تھی۔ میرے دماغ میں یہ بات تھی کہ الرسالہ زیادہ تر جدید حلقہ میں پڑھا جاتا ہے، علماء الرسالہ نہیں پڑھتے۔ مگر کانفرنس کا منظر کچھ اور ہی تھا۔ یہاں بڑی تعداد میں علماء موجود تھے۔ یہ سارے علماء نہایت سنجیدہ اور باصلاحیت ہیں۔ میں نے سارے علماء سے ملاقات کی۔ میں نے پایا کہ سارے علماء الرسالہ کے گہرے قاری ہیں اور الرسالہ مشن سے پوری طرح متفق ہیں۔ ان لوگوں نے یہ اعتراف کیا کہ مولانا نے قرآن اور سیرت کے ایسے پہلوؤں کو کھولا ہے جن کو ہمارے علم کے مطابق، مولانا سے پہلے کسی عالم نے نہیں کھولا۔ مثلاً دعوت الی اللہ کا بے آمیز تصور، خدا کی اعلیٰ شعوری معرفت، دنیا کے دارالانسان یا دارالدعوہ ہونے کی حیثیت، وغیرہ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان میں زیادہ تر علماء نوجوان ہیں جو علمی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی سنجیدہ ہیں۔ میں نے اس سے پہلے کسی عالم کو نہیں پایا جو اتنا سنجیدہ ہو، جو مستقل دعوتی فکر میں جیتا ہو اور بالکل کھلے طور پر ڈسکشن کا مزاج رکھتا ہو۔ الرسالہ مشن سے وابستہ یہ علماء اِس اعتبار سے ایک استثناء (exception) تھے۔ یہ یقیناً خدا کی خصوصی نصرت ہے۔ یہ علماء ملک کے بڑے بڑے مدرسوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان میں ندوی، قاسمی، سلفی، عمری ہر طبقے کے علماء موجود تھے۔ (حافظ ابوالحکم محمد دانیال، بی ایس سی، پٹنہ، بہار)۔

● دعوہ میٹ میں شرکت کا دن میری زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔ اِس میں مجھے دعوت کے موضوع پر مولانا کی ایمان افروز تقریریں سننے کا موقع ملا۔ اس میں لانچ کئے گئے 'القرآن مشن' کے مقاصد اور اِدخالِ کلمہ کے مفہوم پر مولانا نے اظہارِ خیال کیا۔ ان کی باتوں سے محسوس ہوتا تھا کہ دعوت الی اللہ کا درد ان کے رگ وریشے میں سیرایت کر گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کی جدید تاریخ میں مولانا کا مقام ایک استثنائی مقام ہے۔ مولانا نے جس طرح دعوت الی اللہ کو اپنا supreme concern بنایا ہے، وہ بلاتشبیہ اسی پیغمبرانہ بصیرت کا حصہ ہے جس کا اظہار ہمیں حجۃ الوداع کے موقع پر ملتا ہے۔ جب پیغمبر اسلام نے میدان عرفات میں اپنے اصحاب سے خطاب کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ کیا تم لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ میں نے خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیا، تو سب نے بیک زبان کہا تھا کہ ہاں، ہم گواہی دیتے ہیں۔ ہمارے دور کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ خطبۂ حجۃ الوداع جو رسولِ خدا کی زندگی کا آخری خطبہ تھا، اس کے اندر چھپا ہوا دعوت کا پیغام اپنی بے آمیز صورت میں ہمارے اہلِ علم ودانش پر آشکارا نہ ہوسکا۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس نے مولانا وحید الدین خاں کے ذریعے اب اس پیغام اور اس حکمتِ ربانی کو دنیا پر افشا کردیا ہے۔ (احمد شناس، جموں وکشمیر)

- I can say that the Dawah Meet-2010 was the third turning point in my life. The first, when I discovered the Truth sometime in 1993–1994 and the second, when I met Maulana Wahiduddin Khan for first time in Delhi in 1994.The meet gave me, for the first time, the clear and unambiguous mission of true Dawah. Now I have a very clear mission to spread the word of God to one and all without any exception. Maulana used the word of seven billion roohen (souls) as the target of our mission. This meet provided me again the first time the opportunity to meet so many daees at one place. The effect of interaction and exchange of ideas was overwhelming. The lectures by Maulana clarified many doubts related to a daee's position as regards the mad'u. The importance of talif-e-qalb was explained beyond any doubt. The urgency of purpose and nearness of the Day of Judgment was more than explained by Maulana Sb's heart-touching lectures. Now the only purpose of our lives, till the end, will be to communicate the word of God to all the souls inhabiting the earth, Insha Allah. (Sajid Anwar Roorki, UP)

- I consider myself extremely lucky in getting a chance to attend the Dawah Meet 2010. Listening to the Maulana Wahiduddin Khan and

so many "Al-Risala angel" (and interacting with some of them)was a hugely enriching experience. Yet again, the importance of discovering Allah and sharing the discovery with people around was driven home to us. We got to learn that dawah is not just about delivering the Quran and other material to the madu, it's about having true love and deep sympathy in your heart for them as well as praying for them. Any negligence in this regard would be at the cost of Jannah, the ultimate cost indeed. And the price to pay for meaningful dawah work is to change one's lifestyle, behavior and character. Another very important thing we learnt was that one has to discover the starting point to do dawah work and start with what is possible. The dai can't afford to wait any longer as the alarm of qayamat has already been sounded.Taleef-e-qalb of the madu is of the utmost importance. There is no limit to it. One has to be prepared to go to great lengths to please the madu and make a place in their heart. The da'is work may appear difficult but it can be made easy with dua and tawakkul.When the Maulana told us that he hoped we were the Ikhwan-e-Rasul (brothers of the messenger) mentioned in a hadith we couldn't but feel thrilled and exhiliarated. (Anwar Imam Ghazali, Patna, Bihar)

- As far my impressions of Da'wah meet 2010 is concerned, I would say I fail to find words for it. Ever since I was first introduced to Maulana's literature in 1976, it has always served as a great source of inspiration and motivation. His writing awakened me to the greater purpose of my own life: Da'wah work. It has become my primary mission and one that I wish to continue to work for tirelessly for the rest of my life. However, no matter how much self-motivation we may have, we all need a battery charge now and then. The Da'wah Meet provided this recharge for me. Listening to Maulana's words, and also meeting and hearing from so many others who are engaged in this work in India and around the world, provided me with new motivation and reinvigorated the Da'wah. The Prophet mentioned that towards the end of time, there will emerge a group known as the "Ikhwan-e-Rasul" that will do this work. It is my sincere hope that those engaged in this work under Maulana's leadership can become eligible to be part of that group that the Prophet spoke of so highly. (Khaja Kaleemuddin, USA)

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر
اتحاد ملت
احیاء اسلام
اسباق تاریخ
اسفار ہند
اسلام: ایک تعارف
اسلام: ایک عظیم جدوجہد
اسلام اور عصر حاضر
اسلام پندرہویں صدی میں
اسلام دور جدید کا خالق
اسلام دین فطرت
اسلام کا تعارف
اسلام کیا ہے
اسلامی تعلیمات
اسلامی دعوت
اسلامی زندگی
اقوالِ حکمت
الاسلام
الربانیۃ
*امن عالم
امہات المومنین
انسان اپنے آپ کو پہچان
*انسان کی منزل
ایمانی طاقت
آخری سفر
باغ جنت
پیغمبر اسلام
پیغمبر انقلاب
تذکیر القرآن (مکمل)
تاریخ دعوت حق
تاریخ کا سبق
تبلیغی تحریک
تجدید دین
تصویر ملت
تعارف اسلام
تعبیر کی غلطی
تعدد ازواج
تعمیر انسانیت

تعمیر حیات
تعمیر کی طرف
تعمیر ملت
حدیث رسول
حقیقت حج
حقیقت کی تلاش
حل یہاں ہے
حیات طیبہ
خاتونِ اسلام
خدا اور انسان
خلیج ڈائری
دعوت اسلام
دعوت حق
دین انسانیت
دین کامل
دین کی سیاسی تعبیر
دین کیا ہے
*دین وشریعت
دینی تعلیم
ڈائری 1983-84
ڈائری 1989-90
ڈائری 1991-92
*ڈائری 1993-94
راز حیات
راہ عمل
راہیں بند نہیں
روشن مستقبل
رہنمائے حیات (کتابچہ)
*رہنمائے حیات
زلزلہ قیامت
سبق آموز واقعات
سچا راستہ
سفر نامہ اسپین و فلسطین
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)
سوشلزم اور اسلام
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
*سیرتِ رسول

شتم رسول کا مسئلہ
صراطِ مستقیم
صوم رمضان
طلاق اسلام میں
ظہور اسلام
عظمت اسلام
عظمت صحابہ
عظمت قرآن
عظمتِ مومن
عقلیاتِ اسلام
علما اور دور جدید
*عورت معمارِ انسانیت
فسادات کا مسئلہ
فکر اسلامی
قال اللہ وقال الرسول
قرآن کا مطلوب انسان
قیادت نامہ
کاروانِ ملت
کتاب زندگی
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
مذہب اور جدید چیلنج
مذہب اور سائنس
*مسائل اجتہاد
مضامین اسلام
*مطالعۂ حدیث
*مطالعۂ سیرت (کتابچہ)
*مطالعۂ سیرت
*مطالعۂ قرآن
منزل کی طرف
*مولانا مودودی شخصیت اور تحریک
میوات کا سفر
نار جہنم
نشری تقریریں
ہندستان آزادی کے بعد
ہندستانی مسلمان
*ہند۔پاک ڈائری
یکساں سول کوڈ

* نئی کتابیں